ماتم یک شہر آرزو
(افسانے)
نگار سجاد ظہیر
قرطاس

# Ebook By

# Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

# ۔۔۔ماتم یک شہرِ آرزو

(افسانے)

نگار سجاد ظہیر

قرطاس

جملہ حقوق محفوظ

قرطاس

سلسلۂ مطبوعات - ۱۰۹

طبع اول --- مارچ: ۲۰۱۵ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

ISBN: 978-969-9640-11-7

قرطاس

فلیٹ نمبر A-15، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر بلاک 15، کراچی

موبائل: 0321-3899909 ای میل: saudzaheer@gmail.com

ویب سائٹ: www.qirtas.co.nr

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا

## انتساب

سعدیہ ظہیر کے نام

# فہرست

# بس ایک بات۔۔۔

روایت شکنی، اس وقت درست نہیں جب نشانے پر کوئی خوبصورت روایت یا کوئی اہم قدر ہو، البتہ اس صورت میں درست ہی نہیں ضروری بھی ہو جاتی ہے جب روایت ہی اچھی نہ ہو۔

پاکستان میں یہ روایت رہی ہے کہ مصنف اپنی کتاب پر خواہ وہ سفرنامہ ہو، یا شاعری، افسانہ نگاری ہو یا تنقید، ماہرینِ فن سے کچھ لکھوانا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کچھ ''مقدمہ'' بھی ہوسکتا ہے، ''پیش لفظ'' بھی ''حرفِ چند'' بھی ہوسکتا ہے، ''ابتدائیہ'' بھی اور ''تقریظ'' بھی۔ ان میں ایک جیسے جملوں کی تکرار ''حرف'' کے اعتبار کو مجروح کر دیتی ہے۔

وہ کتابیں جو تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہیں، ان میں اس خوامخواہ کے اہتمام یا تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ ''تخلیق'' کیا، کیوں اور کیسے کا بذاتِ خود جواب ہوتی ہے۔ تخلیق کار جب اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو پھر آگے نقادانِ ادب کا کام ہوتا ہے۔ مصنف کو اپنی تخلیق کے ساتھ ساتھ کچھ ''توصیفی کلمات''، ''لکھوائے گئے بیانات'' اور ''زبردستی کی تحریروں'' کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ اُسے پورے اعتماد سے اپنی تخلیق پیش کرنی چاہیے اور بس۔

علمی، تحقیقی، تاریخی اور سائنسی نوعیت کی کتابیں البتہ ایک مضبوط ''مقدمہ'' کی حامل ہونی چاہئیں۔ یہ ایک صحت مند علمی روایت ہے، جسے قائم رہنا چاہیے۔ کیونکہ علمی و تحقیقی کتابوں کا یہ مقدمہ ''تقریظ'' نہیں ہوتا بلکہ محقق، مدون، مرتب یا مترجم کا ایسا بیانیہ ہوتا ہے جسے پڑھ کر کتاب کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور جو متن کتاب کی عقدہ کشائی کے لیے بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

آج سے بیس سال قبل میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دستِ قاتل'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تو میں نے بھی اس پر ماہرینِ ادب کی رائے لی تھی جو بڑی قابل احترام تھی۔ جب دوسرا افسانوی مجموعہ ''بارِ ہستی'' (۲۰۰۰ء) آیا تو یہ اہتمام نہیں تھا۔ جسے 'گستاخی' پر محمول کیا گیا۔ اب تیسرا مجموعہ ''......ماتم یک شہرِ آرزو'' اسی گستاخی کا اعادہ ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ''حرف'' کی حرمت کو بحال کیا جائے۔

نگار سجاد ظہیر

۵ / مارچ ۲۰۱۵ء

کراچی

## ۔۔۔ماتم یک شہر آرزو

تم تو بالکل قنوطی ہو گئے ہو ساجد کبیر، اتنا خوبصورت موسم اور ایسا واہیات موڈ؟
یار تم تو کبھی ایسے نہ تھے!
وہ اپنے اوپر نفرین کستا رہا
اس کی گود میں ایک تازہ ناول دھرا تھا، جو ایک ہی سال میں تین بار شائع ہوا تھا اور جسے وہ گذشتہ ایک گھنٹے سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''خوبصورت موسم۔۔۔کوئی خوبصورت کتاب اور گرما گرم چائے یا کافی۔۔۔۔تمہیں اور کیا چاہئے ساجد کبیر؟ ابھی ابھی مہر دین تمہیں ایک کپ گرما گرم چائے بھی دے گیا ہے۔تو ساجد کبیر مرحوم ومغفور اب تمہیں کس بات کا انتظار ہے؟''
وہ سوچتا رہا۔
ہاں واقعی اُسے کس بات کا انتظار تھا؟
''شعاع کا'' اس کا گویا رواں رواں بول اٹھا
''ہاں تو شعاع کہاں ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔
یہی تو مسئلہ تھا
ان دنوں اس گھر کا سب سے بڑا مسئلہ!
اور اس مسئلے کو سر اٹھائے سال سے اوپر نہیں ہوا تھا۔
مسئلہ یہ تھا کہ جب وہ سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ گھر آتا تھا تو شعاع عموماً گھر پر نہیں ہوتی

تھی، اگر ہوتی بھی تھی تو اس کے لیے نہیں ہوتی تھی، اس کی ادبی مصروفیات کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا، کبھی مشاعرہ، کبھی کوئی ادبی نشست۔۔۔ شامِ افسانہ۔۔۔ ٹی۔وی پروگرام۔۔۔

وہ ایک پرائیویٹ کالج میں انگریزی ادب کی ٹیچر تھی۔ کالج وین میں ہی آتی جاتی تھی۔ وہ کالج سے عموماً دو بجے تک واپس آجاتی تھی۔ گھر میں بچوں کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ کبھی گھر پر ہی ہوتی اور کبھی باہر نکلنے کی تیاری شروع کر دیتی، کبھی وہ ساجد کبیر کے آنے سے قبل نکل جاتی۔۔۔ کبھی اس کے آنے کے بعد۔

ایک تو اس کا باہر جانا، اور پھر ریحان کے ساتھ جانا۔۔۔ کبھی اُسے غصہ آتا، کبھی شدید کوفت میں مبتلا ہو جاتا۔۔۔ مگر وہ اس پر شک کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ہاں تو ساجد کبیر۔۔۔ اب شکایت کیسی۔۔۔ تم تو اُسے جانتے تھے۔۔۔ تمہیں تو معلوم تھا نا کہ شعاع کوئی گھریلو لڑکی نہیں تھی۔۔۔ وہ بنیادی طور پر شاعرہ تھی۔۔۔ موڈی۔۔۔ جذباتی۔۔۔ متلون مزاج۔۔۔ سنا ہے شاعر حساس ہوتے ہیں مگر اس میں کسی قدر سفاکی تھی۔۔۔ شادی سے پہلے تو تمہیں اس کی شکل وصورت بڑی معصوم لگتی تھی۔۔۔ اس کی ہر ادا اچھی لگتی تھی۔۔۔ تم تو اس کی شاعری کے بھی دیوانے تھے۔۔۔ بس یار ساجد کبیر تم سے یہیں غلطی ہوگئی۔۔۔ تم شادی کے بعد بھی عاشق ہی بنے رہے۔۔۔"

اُس نے خود کو کوستے ہوئے پھر ناول اٹھا لیا۔ خدا جانے کب سے وہ یہ ناول پڑھ رہا تھا، ابھی تک تیسرے صفحے پر ہی تھا۔

اندر لاونج میں ٹی۔وی کے آگے ہوم ورک کرتی دونوں بچیوں حرا اور ندا میں کوئی جھڑپ ہوگئی۔ ایسی بچیاں بھی نہیں تھیں، حرا دس سال اور ندا گیارہ سال کی تھی، لیکن دن میں جب تک دو تین بار 'جھڑپ' نہ ہو، گزارا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اٹھ کر اندر چلا گیا، اُسے دیکھتے ہی دونوں بیک وقت بولنے لگیں۔ بڑی مشکل سے ان میں صلح کرائی اور وہیں ٹی۔وی کے آگے بیٹھ گیا۔

بے مقصد چینل بدلتا رہا۔ اُس نے سوچا کہ کوئی کام ہی کر لے، کل کا لیکچر دیکھ لے۔۔۔ اگلے ماہ

ہونے والے سیمینار کی تیاری کر لے۔۔۔ یہ سوچتے ہی اس پر تھکن طاری ہونے لگی
یونی ورسٹی سے آنے کے بعد اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا کہ تھک جاتا۔ تو کیا وہ بھی تھک
جاتے ہیں جو کچھ نہیں کرتے؟؟؟

لاونج میں لگی گھڑی نے آٹھ بجنے کا اشارہ دیا۔ شعاع ابھی تک نہیں آئی۔۔۔

صرف ایک شعاع کے گھر پر نہ ہونے سے اس کی ساری کارکردگی صفر ہو جاتی تھی۔ وہ ان بارہ
سالوں میں شعاع کا بری طرح عادی ہو گیا تھا۔

''مما نے کب تک آنے کو کہا تھا؟'' بالآخر اُس نے ندا سے پوچھا جو ہوم ورک مکمل کر کے اپنی
کاپیاں کتابیں سمیٹ رہی تھی۔

''مما نے کہا تھا اُنہیں دیر ہو جائے گی۔''

''مما کو لینے کون آیا تھا؟''

''ریحان انکل آئے تھے۔۔۔''

اُسے شعاع پر غصہ آنے لگا ''اور کون کون تھا گاڑی میں؟'' پتا نہیں وہ کیا جاننا چاہتا تھا۔

''ریحان انکل تھے۔۔۔ اور ایک ان کے کوئی دوست بھی تھے۔'' حرا نے اطلاع دی۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی، مہر دین نے فون سنا اور پھر قریب آ کر کہا

''بیٹا، بی بی کا فون تھا کہہ رہی تھیں آپ لوگ کھانا کھا لیں، وہ کھانا کھا کر آئیں گی۔''

''حد ہے بھئی۔۔۔'' وہ بڑبڑایا ''آج اس سے بات کروں گا، آخر یہ کیا تک ہے۔۔۔''

مہر دین نے کھانا لگا دیا، بچوں نے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔

شام سے خنکی بڑھنے لگی تھی۔ کھانے کے بعد وہ پھر لاونج میں ٹی۔وی کے آگے بیٹھ گیا۔

''حد ہے ساجد کبیر۔۔۔ تم اتنے مہمل۔۔۔ بے کار اور احمق تو نہ تھے۔۔۔ اس طرح وقت ضائع
کرنے کا کیا تک ہے؟۔۔۔ مانا کہ شعاع گھر پر نہیں ہے، گئی ہے تو آ بھی جائے گی۔۔۔ تم
کیوں اس کے انتظار میں گاؤدی بنے بیٹھے ہو۔''

اس نے پھر خود پر نفرین کی۔۔۔ اور پھر بے مقصد چینل گھمانا شروع کر دیا۔۔۔ کبھی ناول اٹھا

لیتا۔۔۔کبھی ریموٹ اٹھالیتا۔

گھڑی نے دس بجائے تو اس کا غصہ اضطراب میں بدلنے لگا۔

وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، ضدی بھی تھی، خدا جانے وہ اس کے آگے اتنا کمزور کیوں ہو جاتا تھا۔ اُسے یاد تھا شادی سے پہلے ایک بار اُس نے شعاع سے کہا تھا ''شعاع کو قید تو نہیں کیا جاسکتا۔۔۔لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے گھر میں قید کرلوں۔۔۔تمہاری ساری توانائیاں مجھ میں اور میرے گھر میں جذب ہوتی رہیں اور بس۔۔۔''

''قطعی جاگیردارانہ سوچ۔۔۔وہی روایتی مردانہ منطق۔۔۔'' اُس نے تنک کر لیکن قدرے مسکرا کر کہا تھا۔

ایک ایک کر کے گھر کی بتیاں بجھنے لگی تھیں۔۔۔اُس نے ہاتھ میں پکڑے ناول کو بند کر دیا۔۔۔ گذشتہ کئی گھنٹوں میں جس کا اس نے صرف ایک باب پڑھا تھا، باب بھی ایسا جو فقط بارہ صفحات پر محیط تھا۔

''حد ہوگئی ساجد کبیر۔۔۔'' اس نے خود پر دانت پیسے اور لاؤنج کی لائٹ بند کر کے اپنے کمرے میں آنے ہی لگا تھا کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

اُس نے گھڑی دیکھی، پونے گیارہ بج رہے تھے۔

وہ ہشاش بشاش، خوش وخرم پرس جھلاتی اندر آئی۔ ساجد نے کھڑکی سے دیکھا تھا، ریحان اُسے چھوڑنے آیا تھا۔

''کیسی رہی تمہاری نشست۔۔۔''

''بہت اچھی۔۔۔''

''کیا تمہیں زیادہ دیر نہیں ہوگئی۔۔۔''

''ہاں۔۔۔نشست شروع ہی دیر سے ہوئی تھی۔۔۔ بچے کیا سوگئے؟''۔۔۔ وہ سوال کرتی، بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

عجیب بات ہے اس کا غصہ، کوفت، قنوطیت زائل ہونے لگی۔۔۔اور ''باز پرس'' کا پروگرام آئندہ

پر ملتوی کر کے وہ سونے کی تیاری کرنے لگا۔

---

وہ محض سات سال کا تھا جب گاڑی کے حادثے میں اس کی امی اور ابو دونوں، چند دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد چل بسے تھے۔ وہ اپنے سے دس سال بڑی بہن یاسمین اور دادا، دادی کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا۔

جب یاسمین باجی کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ قطر چلی گئیں تو اس کی تنہائی اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی یونی ورسٹی کی تعلیم ختم ہوئی تو دادی چل بسیں۔۔۔ اس کا اکلاپا اُسے اور ڈسنے لگا۔۔۔ پھر دادا صاحب فراش ہوگئے تھے۔۔۔ اُس نے ان کی بڑی خدمت کی، لیکن وہ انہیں روک نہ سکا۔ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل ہی اُسے یونی ورسٹی میں لیکچر شپ مل گئی تھی۔ اُس نے اسی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم اے کیا تھا اور اب یہیں ملازمت کا آغاز کیا۔ یہیں اس کی شعاع سے ملاقات ہوئی تھی۔ یونیورسٹی میں ہونے والے ایک مشاعرہ میں اس نے اپنا خوبصورت کلام سنایا تھا۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی، اس میں انداز بھی تھا، ایک رکھ رکھاؤ۔۔۔ ایک اسٹائل۔۔۔

اس وقت وہ انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں سال آخر کی طالبہ تھی۔

خود ساجد کبیر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، لمبا قد، کسرتی بدن، کھلتا رنگ، مہذب، شائستہ، برسرِ روزگار۔ دونوں بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے اور ایک دوسرے کے لیے گویا لازم و ملزوم ہوگئے۔

شعاع سے شادی نے اُسے مکمل کر دیا۔ اُس کی تنہائی اور اداسیاں ختم ہونے لگیں۔

ماضی کے خوفناک حادثے اُس کے ذہن کے پردے سے دھندلانے لگے۔ شادی کے ایک سال بعد ندا اور اس کے ایک سال بعد حرا، اور مزید آٹھ سال بعد کامران کی آمد نے گویا اس کا گھر مکمل کر دیا تھا۔ یہ گھر اور اس کا پُرسکون ماحول اس کے لیے بہت اہم تھا۔ بہت زیادہ اہم۔

دس گیارہ سال معاملات ایسے رہے کہ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھنے لگا تھا۔

دو سال قبل شعاع کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا، اور مشاعروں، ادبی نشستوں اور ٹی۔ وی پروگراموں میں اس کی ڈیمانڈ بڑھ گئی۔

پچھلے سال سے ریحان بھی اس کی مصروفیات میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ کافی عرصہ اس صورتِ حال کو نظر انداز کرتا رہا۔ شعاع بہت ضدی اور قدرے ہٹ دھرم تھی وہ گھر میں کوئی فساد کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن جب زارا اس سے ملنے آئی تو اسے معاملہ کی سنگینی کا احساس ہوا۔

---

پہلے کلاسیں پھر لیب۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں سہ پہر میں پہنچا، ابھی اس نے اپنا لیب کوٹ اُتارا ہی تھا کہ وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔

وہ اس کی کوئی اسٹوڈنٹ نہیں تھی، تیس پینتیس سالہ خاتون۔۔۔ یا شاید عمر اس سے زائد ہو، اس کے انداز میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔۔۔ چہرے پر اداسی کھنڈی ہوئی تھی۔

''جی فرمائیے'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میرا نام زارا ہے۔۔۔ زارا احمد علی''

وہ چونک گیا، یہ نام سنا سنا سا لگ رہا تھا۔

''تشریف رکھیے'' ساجد نے اُس کے لیے جگہ چھوڑی تو وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی

چند لمحے وہ کشمکش میں رہی، کہاں سے بات شروع کرے

ساجد اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، یہ کون ہے، اور اس سے ملنے کیوں آئی ہے۔

''ڈاکٹر ساجد آپ ریحان کو جانتے ہیں؟'' اُس نے بالآخر پوچھا

''کون ریحان شاد۔۔۔؟''

''جی''

''جی ہاں جانتا ہوں''

''نہیں آپ نہیں جانتے'' اُس نے کہا ''یا شاید آپ جاننا نہیں چاہتے'' اُس کے لہجے میں قدرے تلخی تھی۔ ''یہ کمینہ شخص میرا شوہر ہے۔۔۔ اور آج کل آپ کی بیوی کے چکر میں ہے۔۔۔آپ کی بیوی ایک احمق عورت ہے۔۔۔اگر وہ آپ جیسے انسان کو چھوڑ کے۔۔۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور دروازے سے نکل گئی۔ وہ ایک سال تک شتر مرغ بنا رہا تھا، لیکن اب تو بات پھیل رہی تھی۔ اور بات بڑی رسوائی کی تھی۔

وہ بڑی دیر سناٹے میں بیٹھا رہا۔

---

وہ بہت پریشان تھا، جب گھر واپس آیا۔ گھر میں سب کچھ نارمل تھا۔ اگر وہ شعاع سے بات کرتا تو یقیناً وہ جھگڑا کرتی اور گھر کا ماحول تباہ ہو جاتا اور وہ ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا، بچوں پر اس کے بُرے اثرات پڑتے۔ تو کیا وہ یہ معاملات یونہی چھوڑ دے، یہ بھی مناسب نہیں تھا۔ گذشتہ پورے سال اُس نے اپنی گفتگو اور رویے سے یہ جتایا تھا کہ وہ اس کی بہت زیادہ سماجی مصروفیات اور ریحان کے ساتھ باہر جانا بالکل پسند نہیں کرتا، لیکن شعاع نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد جب بچے سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ دونوں ٹی۔ وی لاونج میں تھے تو اس نے شعاع سے کہا،

''آج زارا احمد علی آئی تھیں۔۔۔''

شعاع کو جیسے کرنٹ لگ گیا ''یہ حرافہ یونی ورسٹی بھی پہنچ گئی۔ یہ مجھے بدنام کرتی پھرتی ہے۔''

''تو کیا یہ تمہارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ اس سے اور اس کے شوہر سے کنارا کر لیا جائے، تا کہ بات ہی نہ بنے۔''

''وہ تو چاہتی ہی یہ ہے۔''

''تو کیا غلط چاہتی ہے؟ ریحان اس کا شوہر ہے، ہر عورت کی طرح وہ نہیں چاہتی کہ اس کا شوہر دوسری عورتوں کو گاڑی میں ادبی نشستوں کے بہانے لیے لیے پھرے۔۔۔''

''تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو۔۔۔'' شعاع بپھر گئی۔

''میرے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ زمانہ ایسا سمجھ رہا ہے۔ تمہیں ہوشمندی سے کام لینا ہوگا، ہمارے آگے بھی دو بیٹیاں ہیں۔۔۔'' ساجد کبیر کا لہجہ اچانک سخت ہوگیا۔ اتنا سخت کہ شعاع کو یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھی اور پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور پھر ایک ہفتے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

گھر کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا، وہ خاموش تھا، وقت کے فیصلے کے انتظار میں!

کئی ہفتے گذر گئے، شعاع کی مصروفیات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہفتے میں ایک دو بار اب بھی وہ ریحان کے ساتھ جاتی تھی، کسی کتاب کی رونمائی میں، کسی ادبی نشست میں، کسی مشاعرے میں۔۔۔ خواہ اس دن شہر میں یہ تقریبات ہوں یا نہ ہوں۔۔۔

دھماکے سے جو تباہی ہوتی ہے، وہ تو ہوتی ہی ہے!

لیکن پھر یہ ہے کہ اس کے تابکاری اثرات برسوں پر محیط ہوتے ہیں اور نسلوں کو کھا جاتے ہیں۔

اُس صبح ناشتہ کی میز پر شعاع کا اعلان ایسا ہی تھا

''میرا اسکالرشپ منظور ہوگیا ہے'' اُس نے چائے کے کپ پر نظر جمائے اُس سے کہا ''سیمسٹر ستمبر میں شروع ہوگا، اگست کے اواخر تک مجھے ایڈنبرا پہنچنا ہے۔''

''اسکالرشپ؟۔۔۔ کب اپلائی کیا تھا؟'' ساجد ہکا بکا رہ گیا، لیکن اسی وقت شعاع کے کالج کی وین کی پوں پاں شروع ہوگئی اور وہ جواب دیئے بغیر، چائے کا کپ چھوڑ کر اٹھ گئی۔

اُس نے بات شروع کرنے کے لیے بڑے موزوں وقت کا انتخاب کیا تھا۔ پورے سکون اور اعتماد سے کیے گئے اس اعلان نے ساجد کبیر پر بڑے برے اثرات مرتب کیے، وہ خود کو اور کمزور محسوس کرنے لگا کہ شعاع کے سکون اور اعتماد کے پیچھے کوئی تھا، ورنہ کوئی عورت اتنی مضبوطی سے فیصلے نہیں کرتی۔

وہ سارا دن سوچتا رہا کہ آخر اس نے اسکالرشپ کے لیے کب اپلائی کیا؟ اس سے اجازت تو درکار مشورہ تک کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ آخر وہ اس کا شوہر تھا شعاع پر اس کا حق تھا۔

وہ اُسے روک بھی سکتا ہے، شعاع کو چاہئے تھا کہ اس سے اجازت لے لیتی، اجازت نہ سہی مشورہ ہی کر لیتی، اس طرح کے فیصلے شعاع کو تن تنہا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ گھر ان دونوں کا ہے، یہ بچے ان دونوں کے ہیں، وہ کیسے اس گھر کے مسائل سے آنکھیں بند کر کے صرف اپنی ذات کے لیے ایک فیصلہ کر سکتی ہے؟

وہ خود بھی تو شعاع کے بغیر بالکل قنوطی ہو جایا کرتا تھا، اُسے تو سب سے زیادہ شعاع کی ضرورت تھی۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شعاع کو منع کر دے گا۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں، وہ بعد میں بھی جا سکتی ہے۔ لیکن جب اُس نے یہ بات کی تو شعاع بھڑک اٹھی۔

اور پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ کسی حال میں رُکنے پر تیار نہیں تھی، بقول اس کے وہ ایک سال بعد واپس آ جائے گی۔۔۔ آخر اس سے کیا قیامت آ جائے گی؟

اُس نے ہر حربہ استعمال کر دیکھا، غصہ، ناراضگی، پیار، وہ عجیب ہی خود غرض مٹی کی بنی ہوئی تھی! ضدی بھی تھی اگست سے پہلے ہی چلی گئی۔ وہ عورت جسے اُس کے بچوں کے آنسو نہ روک سکے، شوہر کہاں سے روک لیتا؟

اور پھر اُس جیسا کمزور شوہر!

شعاع کے جانے سے گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا، حالانکہ سب ہی گھر میں موجود تھے۔ شعاع کے جانے کے ایک ہفتہ بعد اُس نے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی "مشہور شاعر اور افسانہ نگار ریحان شاد، مختلف مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں شرکت کرنے کے لیے آج برطانیہ روانہ ہو گئے، برطانیہ میں ان کا قیام چھ ماہ رہے گا جس دوران وہ بریڈ فورڈ اور ایڈنبرا میں بھی تقریبات میں شرکت کریں گے۔

✿✿✿

۲۸ر نومبر ۱۹۹۹ء

(غیر مطبوعہ)

# زندگی

بیڈروم کے ایک کونے پر پڑی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسعود گذشتہ گھنٹے بھر سے سوچ رہا تھا کہ کام کہاں سے شروع کرے؟ اس نوعیت کا کام اس سے قبل اس نے کبھی نہیں کیا تھا، حالانکہ زندگی میں کئی بار سفر کیا تھا، کئی بار گھر بند کرنا پڑا تھا مگر ہر دفعہ یہ سارا کام ملاحت کیا کرتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بستر کے قریب رکھی سائیڈ ٹیبل پر سے ملاحت کی فریم شدہ تصویر اٹھالی، ملاحت اس کی بیوی تھی، بیس سال زندگی کے گرم و سرد میں اس کا ساتھ دے کر پچھلے ہفتے کار حادثے میں جاں بحق ہوگئی تھی، ایک لمحہ کو ملاحت کی تصویر اس کے ہاتھ میں کانپ گئی۔ اس نے فریم کے شیشے کو اپنے ڈریسنگ گاؤن سے رگڑ کر صاف کیا۔ ملاحت کسی غیر معمولی حسن کی مالکہ نہیں تھی مگر بڑی پرکشش تھی، اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ذہانت، اور چہرے پر پھیلی معصومیت نے اسے بڑی جاذب نظر شخصیت بنادیا تھا۔ اس پر اس کا شائستہ لہجہ، زندگی برتنے کا سلیقہ اور انسانوں سے محبت کرنے کے عمل نے اسے بہت اہم اور خوبصورت بنادیا تھا۔ وہ ایک مقامی کالج میں کیمسٹری پڑھاتی تھی مگر شعر و ادب میں اس کی دلچسپی غیر معمولی تھی۔

چند لمحے تصویر پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد اس نے تصویر سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھ دی، لیکن اس بار تصویر رکھنے کا انداز مختلف تھا، اس نے تصویر اوندھا دی تھی ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ آخر اسے کام کا آغاز تو کرنا ہی تھا۔ چند دن بعد اس کی فلائیٹ تھی، جانے سے قبل اسے یہ گھر بند کرنا تھا، صرف گھر ہی بند نہیں کرنا تھا بلکہ اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ ملاحت سے تعلق رکھنے والی ساری چیزوں کو کہیں حفاظت سے رکھ دے، اتنی حفاظت سے اور ایسی پوشیدہ جگہ پر کہ کچھ

عرصہ بعد جب وہ شگفتہ کے ساتھ واپس آئے تو بظاہر اسے گھر میں ایسی چیزیں نہ ملیں، جس سے اسے اپنی ثانویت کا احساس ہو۔

مسعود کی ملازمت دبئی میں تھی، گذشتہ دس سالوں سے وہ وہیں مقیم تھا، ملاحت اپنی ملازمت اور بچوں کی تعلیم کی وجہ سے کراچی میں ہی تھی، سال میں ایک دو چکر ملاحت دبئی کا لگالیا کرتی اور اسی طرح مسعود بھی سال میں دو تین بار کراچی کا چکر لگالیتا۔ ابتداء میں مسعود دو تین سال کے ارادے سے گیا تھا، مگر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور پھر یہ پورا خاندان اسی طرز زندگی کا عادی ہو گیا۔ ان کے دو بیٹے تھے، وہ دونوں گذشتہ سال ہی مزید تعلیم اور شائد بہتر مستقبل کی تلاش میں امریکہ اپنے ماموں کے پاس جاچکے تھے، ملاحت کراچی میں بالکل تنہا تھی اور مسعود دبئی میں، لیکن مسعود نے اس بات پر اب تک اصرار نہیں کیا تھا کہ ملاحت مستقلاً دبئی اس کے پاس چلی جائے شائد اس کی وجہ شگفتہ رہی ہو۔

شگفتہ اس کے دفتر میں کام کرتی تھی، مسعود کی چار سال قبل اس سے دوستی ہوئی تھی، پھر دوستی کے یہ تعلقات مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ شگفتہ کی اپنے پہلے شوہر مراد سے طلاق ہو چکی تھی، مراد سے اس کی ایک بیٹی زُبدہ تھی، شگفتہ چونتیس، پینتیس سالہ خوش شکل اور بااعتماد خاتون تھی۔ تین چار سالہ دوستی کے نتیجے میں جب ان دونوں نے گویا ایک دوسرے کو قبول کرلیا تو مسعود نے اس سے نکاح کرلیا تھا، لیکن ابھی اس نکاح کو خفیہ ہی رکھا گیا تھا، دونوں یہ طے کر چکے تھے کہ فی الحال شگفتہ اپنی بہن ہی کے ساتھ مقیم رہے گی اور مسعود اپنے فلیٹ میں رہے گا، دونوں ہی کو اپنے خاندان والوں کا ردعمل بھی دیکھنا تھا۔ اس شادی کے بارے میں ملاحت کو ہوا تک نہیں لگنے دی گئی تھی۔ نکاح میں مسعود کے چند بااعتماد دوستوں کے سوا کوئی نہیں تھا اور شگفتہ کی طرف سے اس کی بڑی بہن، بہنوئی اور دو دو دوستوں کے علاوہ کوئی اس تقریب میں شریک نہیں تھا۔

ہاتھ جلنے کے احساس سے مسعود چونک گیا، اس نے سگریٹ سلگائی ضرور تھی، شائد ایک دو کش بھی لیے ہوں اس کے بعد وہ یونہی جلتی اور ضائع ہوتی رہی تھی، اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور تھکے تھکے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے پورے گھر کا چکر

لگایا، یہ گھر ملاحت نے بڑی محبت اور چاؤ سے سجایا تھا۔ مگر بنانے میں اس کی دبئی کی کمائی کام آئی تھی اور گھر کو سجانے سنوارنے میں ملاحت کا شوق اور محبت شامل تھا، وہ بڑی باذوق تھی، اسے گھر سجانے کا سلیقہ آتا تھا، پھر پیسے کی کمی نہ ہونے کے وجہ سے کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا، پورے گھر کا ایک چکر لگانے کے بعد اُس نے ڈرائنگ روم سے کام شروع کرادیا۔ حسن اُس کے ساتھ تھا، یہ ان کا پرانا ملازم تھا، کم وبیش دس سال سے یہ اور اس کی بیوی حمیدہ، اسی گھر میں سروِنٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ حمیدہ گھر کی صفائی، کھانے کی تیاری وغیرہ کیا کرتی اور حسن گھر کی نگہ داری بھی کرتا اور وقت ضرورت ڈرائیوری بھی۔

مسعود نے حسن کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم کو تقریباً محفوظ کردیا تھا حسن نے صوفوں پر چادریں منڈھ دی تھیں تاکہ گرد وغبار سے خراب نہ ہوں۔ سارا آرائشی سامان احتیاط سے چوبی صندوق میں بند کرکے اس میں بڑا سا تالا ڈال کر اسٹور میں رکھ دیا گیا۔ "کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں کبھی کبھی کھول دیا کرنا تاکہ قالین اور صوفوں کو دھوپ لگتی رہے"۔ ڈرائنگ روم پر آخری نظر ڈال کر کمرے سے نکلتے ہوئے مسعود نے حسن کو تاکید کی۔

اسی طرح گیسٹ روم بند کیا گیا، اس کے دونوں بیٹوں عامر اور ناصر کے کمرے اوپر تھے، جو ان کے امریکہ جانے کے بعد بند ہی تھے، انہیں ملاحت کبھی کبھی کھلوا کر صفائی کرادیا کرتی تھی۔

جب مسعود ملاحت کی اسٹڈی میں پہنچا۔ جہاں کالج سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے دن کا بیشتر وقت گذارتی تھی، تو مسعود کو احساس ہوا کہ اس کمرے کو بند کرنا، بالکل ناممکن تھا، دیواروں کے ساتھ لگی الماریوں میں موضوعات کے اعتبار سے لگی ہوئی سینکڑوں کتابیں، شیلف میں رکھی ہوئی اس کی متعدد فائلیں، اس کی میز، گردشی کرسی، میز کے ایک کونے پر رکھا ہوا ٹیلی فون، خطوط کی فائلیں، نوٹس، اور خدا جانے کیا کچھ، مگر سب کچھ ایک ترتیب اور تنظیم کے ساتھ۔ وہ چاہتا تھا کہ جب شگفتہ یہاں آئے تو اسے ایسی چیزوں کے ساتھ سابقہ نہ پڑے جن سے ملاحت کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہو، لیکن یہاں وہ آخر کن کن کتابوں سے ملاحت کا نام مٹاتا،

کن کن چیزوں سے اس کی خوشبو نوچتا؟ کس کس گوشے سے اس کے وجود کے احساس کو ختم کرتا، یہ ایک مشکل کام تھا، لہٰذا اس نے حسن سے کہا "یہ سب کچھ ایسے ہی رہنے دو، مگر اس کی روزآنہ صفائی ضروری ہے ورنہ کتابیں خراب ہو جائیں گی۔"

اسٹڈی کا دروازہ بند کر کے وہ اپنے بیڈروم میں آ گیا یہ کمرہ اس وقت تک بند نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ وہ خود یہاں تھا۔ تاہم ملاحت کی چیزوں کو بہر حال سمیٹ کر کہیں نہ کہیں رکھنا تھا۔

"اب تم جاؤ حمیدہ کو بھیج دو۔۔۔" مسعود نے حسن کو فارغ کرتے ہوئے کہا کیونکہ حمیدہ کو ملاحت کی چیزوں کا زیادہ علم تھا۔ اس نے پھر آرام کرسی پر گر کر سگریٹ سلگا لیا۔

"صاحب آپ نے بلایا؟" حمیدہ دروازے پر کھڑی تھی۔

"ہاں ذرا ملاحت کے کپڑے تو سمیٹو، ایسا کرو جو اچھے کپڑے ہیں انہیں ایک سوٹ کیس میں رکھ کر، حسن سے کہو عامر کے کمرے میں رکھ آئے، جو روزآنہ کے پہنے کے کپڑے تھے، وہ سب تم لے جاؤ، اسی طرح اس کے جوتے اور سینڈلیں بھی دیکھ لو۔۔۔"

"اچھا صاحب۔۔۔" حمیدہ اپنی بیگم صاحبہ کے مرنے پر بہت دلگرفتہ تھی، وہ تھی بھی تو ان پر بہت مہربان، ان کی ضروریات کی فکر کرنے والی۔

"صاحب ہسپتال والوں نے بیگم صاحبہ کے کپڑے، جوتے واپس کئے تھے، وہ میں نے سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں، لے آؤں؟

"لے آؤ۔۔۔" مسعود خالی الذہن ہو رہا تھا

تھوڑی دیر میں حمیدہ ایک تھیلا لیے واپس آئی،

"ہسپتال والوں نے جو کچھ واپس کیا تھا صاحب میں نے اسی میں رکھ دیا تھا، البتہ بیگم صاحبہ کا پرس امجد میاں کو دے دیا تھا۔"

حمیدہ نے وضاحت کی اور ساتھ ہی وہ تھیلا اس کی آرام کرسی کے قریب قالین پر رکھ دیا۔ مسعود کو یاد آیا، ملاحت کا چھوٹا بھائی امجد وہ پرس، جو حادثے کے وقت ملاحت کے پاس تھا، اسے واپس کر چکا تھا، جس میں اس کے کچھ کاغذات وہ ہلکی جیولری جو اس نے حادثے کے وقت پہنی ہوئی

تھی، قریب کی نظر کا چشمہ، جو ٹوٹ چکا تھا، اس کی ایک گھڑی، جو حادثے کے وقت ملاحت کی کلائی پر تھی اور جس کی سوئیاں رات کے ساڑھے نو بجے پر رک گئی تھیں اور جس کا شیشہ چٹخ گیا تھا، کچھ رقم اور چند چابیاں۔۔۔

حمیدہ کپڑوں کی الماری کھول کر ایک ایک سوٹ تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی، ختم ہوجانے والی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر مسعود نے تھیلا کھولا۔ تھیلے میں سے ملاحت کی گولڈن ساری نکلی، جس پر میرون رنگ سے انتہائی خوبصورت اُبھرواں بارڈر اور آنچل بنا ہوا تھا۔ یہ ساری گذشتہ سال اس نے دبئی کے ایک بڑے اسٹور سے خریدی تھی، اور جہاں تک اسے یاد تھا، ملاحت نے یہ ساری صرف ایک بار اپنی پچھلی سالگرہ پر پہنی تھی۔

ان دنوں وہ کراچی آیا ہوا تھا، ۱۳ رنومبر کو اس کی پینتالیسویں سالگرہ تھی، اس دن ان دونوں نے رات کا کھانا باہر کھایا تھا اور پھر ملاحت کی فرمائش پر وہ اسے ساحل پر لے گیا تھا، جہاں وہ دونوں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے، اس وقت مسعود کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد ملاحت اپنا جنم دن منانے کے لیے زندہ نہیں رہے گی، یہ وہ وقت تھا جب شگفتہ سے شادی کے معاملات طے ہو چکے تھے۔

وہی ساری اس کے زانوں پھیلی تھی، ساری، پیٹی کوٹ اور بلاوز پر کئی جگہ خون کے چھوٹے بڑے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔

وہ کہاں گئی تھی؟۔۔۔ کہاں سے واپس آرہی تھی۔ اس کا جواب اسے ابھی تک نہیں مل سکا تھا، حالانکہ اس بارے میں بہتوں سے بات ہوئی تھی،

''حمیدہ۔۔۔ تمہیں پتہ ہے حادثہ والے دن بیگم صاحبہ کہاں گئی تھیں؟''

یہ وہ سوال تھا جو وہ حمیدہ سے متعدد بار پوچھ چکا تھا۔

''معلوم نہیں صاحب'' حمیدہ نے بھی کئی بار کا جواب دہرادیا ''میں بیگم صاحبہ سے ایسے سوال نہیں کرتی تھی۔''

''کیا وہ کچھ بتا کر نہیں گئی تھی کہ کہاں جارہی ہے اور کب تک واپس آئے گی؟''

''جی نہیں صاحب یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کہاں جا رہی ہیں، مگر یہ ضرور کہا تھا کہ رات دس بجے تک واپس آجائیں گی۔

''سات بجے کا وقت تھا صاحب۔۔۔حسن نے تو ساتھ چلنے کا پوچھا تھا، مگر وہ کہہ رہی تھیں کہ خود ہی چلی جائیں گی۔ہاں ایک فون بھی آیا تھا صاحب۔۔۔'' حمیدہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی
''کس کا فون۔۔۔؟''

''یہ تو پتہ نہیں صاحب مگر بیگم صاحبہ اس وقت اسٹڈی میں تھیں، انہوں نے کہا تھا کہ بس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔وہ بہت خوش تھیں صاحب، فون پر بھی بہت ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔پھر فون بند کر کے مجھے یہ کہہ کر چلی گئیں کہ کھانا باہر کھائیں گی اور رات دس بجے تک واپس آجائیں گی، اس دن میری مالکن بہت خوبصورت لگ رہی تھیں صاحب انہیں کسی کی نظر کھا گئی۔۔۔'' حمیدہ رونے بیٹھ گئی۔

مسعود خاموشی سے اٹھ کر اسٹڈی میں آگیا، اس کی میز پر رکھے ہوئے فون کے قریب پڑے کاغذات کو دیکھتا اور الٹتا پلٹتا رہا، لیکن اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا، اس سے قبل وہ ملاحت کی تقریباً ساری سہیلیوں، رشتہ داروں، اور کالج کی ساتھیوں سے معلوم کر چکا تھا، اس دن کہیں ایسی کوئی تقریب نہیں تھی جہاں وہ اتنی خوبصورت ساری اور ایسی تیاری کے ساتھ جاتی۔
وہ کہاں گئی تھی۔۔۔؟
کہاں سے واپس آرہی تھی۔۔۔؟؟

اس نے تھک کر سر گردشی کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔اور ملاحت کے حادثے کے بارے میں پھر سوچنے لگا، اس کی موت اچانک تھی، بہت اچانک، جسے وہ اب تک تسلیم نہیں کر سکا تھا۔ وہ ۳۰ اگست کا دن تھا، اسے دفتر سے اٹھنے میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی، جب وہ گاڑی پر گھر جا رہا تھا تو غیر شعوری طور پر ملاحت اسے یاد آئی، حالانکہ پچھلے چند ماہ سے، جبکہ اس نے شگفتہ سے نکاح کر لیا تھا، ملاحت خاموشی سے پس منظر میں چلی گئی تھی۔اور اس کے ذہن و دل پر صرف شگفتہ کا راج تھا۔اس وقت اس نے سوچا تھا کہ گھر جا کر ملاحت کو فون کر لے گا۔لیکن گھر پہنچتے ہی اسے شگفتہ کا

فون آ گیا، اس کی اکلوتی، دس سالہ بیٹی زُبدہ بیمار تھی، اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔

اسے زبدہ کی بیماری کا علم تھا، اسی وجہ سے دو دن سے شگفتہ دفتر بھی نہیں آ رہی تھی، دن میں بھی دو دفعہ فون کر کے اس نے زبدہ کی خیریت پوچھی تھی، مگر اس کا بخار کم نہیں ہو رہا تھا لہٰذا وہ اسے کلینک لے جانا چاہ رہی تھی۔ چائے کا گرما گرم کپ پی کر وہ شگفتہ کے گھر جانے کے لیے اٹھ گیا، اچانک پھر اسے ملاحت کا خیال آیا، اس نے کلائی موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھا، اس وقت کراچی میں رات کے دس بج رہے ہوں گے ملاحت رات کا کھانا کھا کر اپنی اسٹڈی میں چلی گئی ہوگی۔ ایک فون ان کے بیڈ روم میں تھا اور اسی سے مربوط ایک فون سیٹ اسٹڈی میں رکھا تھا، نہ جانے کلینک سے واپسی میں کتنی دیر ہو جائے۔ ملاحت سو نہ جائے، یہ خیال کر کے اس نے نکلتے نکلتے ملاحت کو فون ملایا، گھنٹی بجتی رہی، کسی نے نہیں اٹھایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ملاحت، ہسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی اور حادثے کی وجہ سے اس کے دماغ میں لگنے والی چوٹ کے سبب ڈاکٹر اس کی زندگی سے قریب قریب مایوس ہو چکے تھے۔

شگفتہ کے ساتھ وہ زبدہ کو ڈاکٹر کو دکھا کر لایا، پھر شگفتہ نے اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ اس کے بہن اور بہنوئی ان دنوں سالانہ چھٹیوں پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ زبدہ دوا کے اثر میں تھی اور جلد ہی سو گئی۔ اور پھر وہ رات بھی وہیں رک گیا تھا، اسے معلوم نہیں تھا، رات ایک بجے کے قریب جب وہ شگفتہ کی زلفوں اور بانہوں میں کھویا ہوا تھا تو ملاحت نے کراچی کے ایک بڑے ہسپتال میں بے ہوشی کے عالم میں ہی آخری سانسیں لی تھیں، اور اس وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا، اس کا شوہر دبئی میں تھا اور دونوں بیٹے امریکہ میں، جتنی دیر میں ملاحت کے رشتہ داروں کو اطلاع ملتی، اور وہ ہسپتال پہنچتے وہ ختم ہو چکی تھی۔

مسعود کو اس کی حادثاتی موت کی اطلاع اگلے دن دفتر میں ملی تھی، ملاحت کے چھوٹے بھائی امجد کا فون تھا، اس نے بتایا کہ رات دو بجے سے وہ مسلسل اسے گھر فون کر رہا ہے، لیکن ادھر صرف گھنٹیاں بج رہی ہیں، اس پر مسعود کو جھوٹ بولنا پڑا کہ وہ اپنے دوست کے گھر دعوت پر گیا تھا اور دیر ہونے کے سبب وہیں رک گیا تھا۔ امجد نے حادثے کی تفصیلات بتانے کے بعد کہا

تھا کہ اس کے انتظار میں لاش کولڈ اسٹوریج میں رکھوادی گئی ہے اور یہ کہ وہ جلد از جلد آجائے۔

گو کہ ملاحت اس کے ذہن کے پردوں میں کہیں پیچھے چلی گئی تھی اور اس کے چہرے کے معصوم نقش، اس کے بصری پردوں میں کہیں معدوم ہونے لگے تھے، اور اس کی آواز دور ہوتے ہوتے شائد ختم ہونے کے قریب تھی، پھر بھی اس خبر سے اسے شدید دھکا پہنچا تھا، اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا ہوگیا ہے، ۵/اگست کی صبح وہ کراچی پہنچ گیا تھا، اس کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، بس گھر والی ہی نہیں تھی۔

یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ گھر آیا تھا اور ملاحت نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم نہیں کیا تھا۔

بہت جلدی چلی گئی تھی، تین ماہ بعد اس کی چھیالیسویں سالگرہ تھی، دیکھنے میں تو وہ اپنی عمر سے کہیں آٹھ دس سال کم ہی لگتی تھی، عامر اور ناصر کے ساتھ چلتی تو زیادہ سے زیادہ ان کی بڑی بہن لگتی۔

اچانک فون کی گھنٹی پر وہ چونک گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی الطاف کا فون تھا جسے اس نے اپنی فلائیٹ کنفرم کرنے کے لیے کہا تھا۔

''آپ کی پرسوں کی فلائیٹ کنفرم ہے بھائی جان۔'' الطاف اسے اطلاع دے رہا تھا'' ٹکٹ میں دفتر سے واپسی پر دیتا جاوں گا۔''

اس کا مطلب تھا کہ وقت بہت کم تھا۔ وہ اسٹڈی سے اٹھ کر واپس بیڈروم میں آ گیا، حمیدہ نے بہت کچھ سمیٹ دیا تھا، ڈریسنگ ٹیبل تھی مگر اس پر سے ملاحت کے میک۔اپ کا سامان ہٹا دیا گیا تھا، کپڑوں کی الماری میں خالی ہینگر جھول رہے تھے، یا مسعود کے کپڑے لٹک رہے تھے، شو ریک بالکل خالی ہوگیا تھا۔ حمیدہ نے جو چیز سمیٹ کر جہاں رکھی تھی اس کی تفصیلات مسعود کو بتاتی رہی۔

''کھانا لے آوں صاحب۔۔۔'' حسن کمرے میں آکر پوچھ رہا تھا۔

''لے آو۔۔۔'' اسے کوئی خاص بھوک تو نہیں تھی، لیکن ابھی کچھ کاموں کے لیے اسے گھر سے نکلنا تھا بلکہ اسے قبرستان بھی آج ہی ہو لینا چاہیے پتہ نہیں کل اسے موقع ملے یا نہ ملے، اور

پرسوں صبح ہی صبح کی فلائیٹ تھی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ تھوری دیر کے لیے لیٹا، شام میں نہا دھو کر قبرستان جانے کے ارادے سے نکلا، ان کی کالونی کا اپنا الگ قبرستان تھا، یہ بہت بڑا نہیں تھا، قبرستان میں چند پختہ قبریں ایسی تھیں جن کے اردگرد احاطہ کھینچ کر چھت ڈالی گئی تھی، بہت سی قبریں کچی تھیں جن کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ ملاحت کی آرام گاہ ایک چھوٹے سے پختہ مقبرہ کے ساتھ ہی تھی۔

وہ قبروں کے درمیان بچتا بچاتا ملاحت کی قبر کے قریب پہنچا تو ٹھٹھک کر رک گیا ملاحت کی قبر پہ ہاتھ رکھے کوئی دوزانو بیٹھا تھا

وہ کون تھا۔۔۔؟

مسعود نے اس سے قبل اسے نہیں دیکھا تھا، ہوسکتا ہے ملاحت کا دور پرے کا کوئی رشتہ دار ہو جس کا اسے علم نہ ہو، لیکن یہ بات ماننے والی نہیں تھی، نہ جانے کیوں وہ آگے بڑھنے کے بجائے، قریبی مقبرے کی دیوار کی اوٹ میں ہوگیا۔

اس شخص کا سر جھکا ہوا تھا، مگر جتنا چہرہ نظر آرہا تھا اسے دیکھ کر مسعود کو لگا جیسے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

''کہاں۔۔۔''؟ وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔

اوہو۔۔۔ اسے یاد آیا، جس دن وہ کراچی پہنچا تھا، اور ہاسپٹل گیا تھا، جہاں کے سردخانے میں ملاحت کی لاش رکھی گئی تھی، اس وقت جب وہ سردخانے میں داخل ہورہا تھا، تو یہ شخص باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت وہ خود اتنا دلگرفتہ تھا کہ اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

اچانک وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے اٹھتے اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تازہ گلاب کا سرخ خوبصورت پھول اس کی قبر پر رکھا تھا۔

وہ لمبے قد اور چھریرے بدن کا زیادہ سے زیادہ چالیس، بیالیس سالہ شخص تھا۔

مسعود کے ذہن میں اچانک ایک اور روشنی کا گولا پھٹا

اسے تو اس نے تدفین والے دن بھی دیکھا تھا، یقیناً جنازے میں شریک رہا ہوگا۔ جس وقت

تدفین ہو رہی تھی وہ ملاحت کی قبر کے سرہانے کھڑا تھا، اسے یاد آیا، اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے اور تھکے ہارے چہرے پر گہری اداسی کی بوندیں برس رہی تھیں۔

یہ کون ہے؟

مسعود کی حیرت بجا تھی۔

وہ شخص چند لمحے خاموش کھڑے رہنے کے بعد واپس جانے کے لیے مڑا تو مسعود مقبرے کی اوٹ سے نکل کر آگے بڑھا۔ مسعود کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا ایسے جیسے اسے اس کی توقع نہ رہی ہو۔ مگر پھر کچھ بولے بغیر، مسعود سے کترا کر نکلنے لگا تو مسعود نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مسعود واسطی۔۔۔'' مسعود نے اپنا تعارف کرایا۔

''جی میں جانتا ہوں۔۔۔'' اس نے جواباً ہاتھ ملایا مگر اپنا تعارف نہیں کرایا۔

حالانکہ مسعود بجا طور پر یہ توقع کر رہا تھا کہ جواباً وہ اپنے آپ کو متعارف کرائے گا،

''آپ کی تعریف۔۔۔''

''ظفر۔۔۔'' وہ انتہائی مختصر جواب دے کر، نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر جانے لگا۔

''معافی چاہتا ہوں۔۔۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا بتائیں گے کہ مرحومہ سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟'' مسعود نے ملائمت سے پوچھا۔

جواباً اس شخص نے جس کا اپنا نام ظفر بتایا تھا، ایک ادھوری نظر مسعود پر ڈالی وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا مگر اس کی آنکھوں کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ مرحومہ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

''ملاحت آپ کی کون تھی؟'' ظفر کی خاموشی سے الجھ کر بالآخر مسعود کو صاف صاف پوچھنا پڑا۔

''زندگی۔۔۔'' اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ جواب دیا اور کسی مزید سوال کا انتظار کئے بغیر، تیز قدموں سے چلتا ہوا، قبرستان کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

❂ ❂ ❂

۱۵ر نومبر ۲۰۰۰ء

مطبوعہ ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد دکن، (فروری ۲۰۰۱ء)

# زخم

''ہاں تو پیارے احمد عباس تم پھر آ گئے کوئی نیا زخم لگا کر؟۔۔۔دل کا کوئی پھپھولا پھوڑنے۔۔۔سمندر سے شرط لگا کر رونے۔۔۔یار تم آدمی ہو یا دونڈ ڈسولجر،تن زخمی، من زخمی، آخر زندگی سے ایسی کیا دشمنی چل رہی ہے جو وہ تمہیں کوئی رعائت نہیں دیتی؟''

سمندر کے کنارے بیٹھے بیٹھے وہ سوچ رہا تھا،اس کی تھکی ہوئی زخمی نظریں متموج سمندر کی اٹھتی گرتی لہروں پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ شائد انہیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ڈھلتے سورج کی کرنیں اس کے گہرے سانولے مگر پرکشش چہرے پر پڑ رہی تھیں مگر وہ ان کی تمازت محسوس نہیں کر رہا تھا۔اس کے اردگرد لوگوں کا،لہروں کا شور ہی شور تھا مگر وہ اندر سے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

''تم کیوں اس قدر بے حس،تنہا اور اداس بیٹھے ہو احمد عباس۔۔۔زندگی کی چوٹیں تمہارے لیے نئی تو نہیں۔۔۔اور جو زخم آج لگا ہے تو کسی دوست کے پاس چلے جاتے،جو تمہیں تسلی دیتا،تمہارا دکھ بانٹتا،لاکھوں کی آبادی والے اس شہر میں کم از کم ڈیڑھ سو دوست تو ہوں گے تمہارے،جن میں بیٹھنا،گپیں مارنا،چوٹیں کرنا،بلند بانگ قہقہے لگانا،روز کا نہ سہی ویک اینڈ کی تفریح تو تھی نا۔۔۔پھر اتنے بہت سے دوستوں میں رہ کر بھی تم تنہا ہو۔۔۔یار کیا فضول آدمی ہو۔۔۔''

وہ خود کو کوسنے لگا اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کب یہاں آ کر بیٹھا تھا،اور کب یہاں سے اٹھے گا۔اور اٹھ کے کہاں جائے گا۔ساحل سمندر کے اطراف میں بنی ہوئی اس دیوار پر وہ بالکل خالی الذہن بیٹھا ہوا تھا،اس کی پشت کی طرف سارا شہر پھیلا ہوا تھا،اور اس کے آگے تاحد نظر سمندر ہی سمندر تھا،پورے چاند کی تاریخیں تھیں لہذا لہروں کا تموج دیدنی تھا۔

"پتہ نہیں احمد عباس تمہارے اندر کا سمندر زیادہ مواج ہے، یا باہر کا۔۔۔مگر یہ تو طے ہے پیارے کہ آج تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔۔۔کچھ بھی تو نہیں۔۔۔اس بری طرح تو تم پہلے کبھی نہیں لٹے تھے۔۔۔ہاں تو پیارے سے، کنگال سے احمد عباس۔۔۔اب کیا ارادہ ہے؟"

اور جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اپنی توجہ ہٹانے کے لیے وہ ساحل سمندر پر تفریح کے لیے آنے والوں کو دیکھنے لگا، کچھ بچے اونٹ کی سیر کر رہے تھے، سجے بنے اونٹوں کی مہار پکڑے غریب شتربان۔۔۔اونٹوں کے پیروں میں بندھے گھنگروں کی چھنا چھن، جو عام دنوں میں اسے اچھی لگا کرتی تھی اس وقت بالکل بے معنی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ذرا ہٹ کر نوعمر لڑکوں کا غول گیند سے کھیل رہا تھا، چونکہ شام گہری ہونے لگی تھی لہذا ارش بھی چھٹنے لگا تھا۔

اچانک ایک نوجوان جوڑا اس کے سامنے سے ہاتھ میں ہاتھ دیئے، گذرا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ لڑکی عذرا رہی ہو، اس نے چونک کر دیکھا، وہی قد کاٹھ، وہی رنگ روپ، وہی شوخ اور چلبلا انداز، مگر وہ عذرا نہیں تھی۔ اچانک ہی لہر لہر اداسی اس کے اندر کے سمندر میں اٹھنے لگی عذرا اس کے کالج کے زمانے کی دوست تھی۔ جس کے ساتھ اس نے بڑا اچھا وقت گذارا تھا، ساتھ بیٹھ کے کھانا پینا، کئی بار کلاسز سے بھاگ کر لان میں بیٹھ کر گپیں مارنا، وہ اپنے کالج کا بہترین مقرر تھا، اور عذرا اس کی زبردست مداح، وہ اس سے بے تکان باتیں کرتی تھی، بعد میں اسے یاد آتا تھا کہ وہ کبھی کبھی اسے بے وقوفی اور بزدلی کے طعنے بھی دیتی تھی۔

"ہاں تو احمد عباس بے وقوف تو تم تھے، اور شائد بزدل بھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو کم از کم اسے پروپوز تو کرتے، ہوسکتا ہے وہ تمہارا پروپوزل قبول کر لیتی، تمہارا انتظار کرتی۔۔۔لیکن یار تمہارا ابھی جواب نہیں، اچھی وہ تمہیں لگتی تھی، لے کوئی اور اڑا۔۔۔اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔۔۔ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔۔۔اس کی شادی ہوگئی اور وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے میاں کے ساتھ سات سمندر پار سدھاری۔۔۔تم نے اس کی یاد میں کچھ اشعار لکھے۔۔۔اندر کے آنسو چھپانے کے لیے دوستوں میں بیٹھ کر بلند بانگ قہقہے لگاتے رہے۔۔۔دل تو پھر تمہارا کالج میں کیا لگنا تھا شکر ہے تعلیم مکمل کر لی۔۔۔وہ بھی اس لیے کہ بھائی کا ڈنڈا سر پر تھا ورنہ یہی

قنوطیت تم نے اس وقت بھی اوڑھ ہی لی تھی پیارے۔۔۔مجنوں کے قبیلے سے تو تم تھے ہی۔۔۔ شکر کرو بچ گئے۔۔۔"

اچانک گینداس کے قریب ہی دیوار سے آ کر ٹکرائی تو وہ چونک گیا، کچھ فاصلے پر کھیلنے والے لڑکوں میں سے ایک آٹھ نو سالہ لڑکا بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا اور گیند اٹھا کر پوری قوت سے اپنے ساتھیوں کی طرف پھینکی۔

"سوری انکل۔۔۔" اس بچے نے عباس سے معذرت طلب کی، شائد اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس نے اس کی محویت کو بری طرح مجروح کیا ہے۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔۔۔" عباس نے ملائمت سے اسے جواب دیا وہ لڑکا واپس اپنے دوستوں کی طرف بھاگ گیا، یہی عمر تو ہوگی احسن کی، اس کے سب سے بڑے بیٹے کی، جسے آج سے پہلے متعدد بار یہاں لے کر آیا تھا اور وہ بھی اسی طرح بچوں کے ساتھ کھیل کود میں منہمک ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ عباس نے ذہن پر زور دیا، جب وہ گھر سے نکلا تھا تو احسن شائد اپنے کمرے میں تھا، بہرحال وہ اس سے ملے بغیر، اسے پیار کیے بغیر چلا آیا تھا۔ اور پھر یہی عمر تو خود اس کی تھی، جب اسے زندگی کی پہلی بڑی چوٹ برداشت کرنی پڑی تھی۔ ربع صدی اُدھر کی بات تھی، جب وہ ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا تب اسے اپنے ابا کی موت کا زخم لگا، جب تک اس کے اباجی زندہ رہے تھے، شائد کسی کو بھی ان کی اہمیت کا اتنا اندازہ نہیں تھا، لیکن جب وہ اچانک سب کے درمیان سے اٹھ گئے تو ایسا لگا جیسے تیز آندھی ان کے گھر کی چھت اڑا لے گئی ہو، وہ چھت جو انہیں موسموں کے شدائد سے بچاتی رہی تھی۔ جب یہ چھتر چھاؤں سر کی تو اس کی امی نے بیوگی کے صدمے کو ایسا اوڑھا کہ وہ اپنے مسئلے مسائل ان تک لے جاتے ہوئے کترانے لگا، بس اس دن کے بعد سے وہ ہزاروں میں رہ کر بھی کبھی کبھی بری طرح تنہا ہو جاتا تھا، بھائیوں کا سہارا اپنی جگہ لیکن اس نے اپنا دل مارنا سیکھ لیا تھا۔ پتہ نہیں ابا کے مرنے پر وہ رویا تھا یا نہیں مگر اتنا تو طے تھا کہ پھر اس نے سختی اور تنگی کے کئی بے درد سال گذارے تھے، اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا کہ گھر میں چولہا جلتا رکھنے کے لیے اسے تعلیم

ادھوری چھوڑ کر ملازمت بھی کرنی پڑی تھی۔ بھائیوں اور برادری کے سہارے نے اسے ختم تو نہیں ہونے دیا مگر یہ تھا کہ وہ کبھی کبھی رش میں بھی تنہا ہو جاتا تھا۔ اور وہی مہیب تنہائی اس وقت اس کی ذات میں چراغاں کیے ہوئے تھی۔ باہر شور ہی شور تھا، لہروں کا شور، بچوں کا شور، شتربانوں، گھوڑے والوں، خوانچے والوں کا شور، عقب کی کشادہ سڑک پر سے گذرنے والی گاڑیوں اور بسوں کا شور، مگر اس کے اندر ایک جاں لیوا سناٹا اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔

"تو گویا احمد عباس ابھی تم زندہ ہو۔۔۔ اتنی مار کھا کے بھی۔۔۔ اب بھی ہنس لیتے ہو۔۔۔ یار بڑے ہی سخت جان ہو۔۔۔ مگر آج کیا ہے پیارے، آج تو بچتے نہیں لگتے۔۔۔"

اس نے خود سے چُہل کی، مگر یہ سب کچھ اسے اوپری سا لگا، بالکل بے کار، اور بے معنی۔۔۔ اس نے زندگی کی سختیوں کو بہت کچھ بھگتا تھا، سب سے زیادہ سخت زمانہ تو وہ تھا جب اس نے آرمی جوائن کی تھی، افسر بننے میں کیسے کیسے رگڑے نہیں کھائے۔ رج کے سزائیں بھگتیں، مہینوں گھر سے دور، گھر کی آسائشوں سے دور، زمانے کے سرد و گرم بھگتتے رہے۔۔۔ گولیاں کھائیں۔۔۔ دوستوں کی موتیں برداشت کیں۔۔۔ خود کئی بار موت سے آنکھ مچولی کھیلی۔۔۔ وردی پر تمغے سجتے گئے اور جسم پر زخموں اور سختیوں کے نشانات۔ ان دنوں تو ایسا لگتا تھا کہ زندگی کے صحرا میں یا بادِ صرصر چلتی ہے یا بادِ سموم، اسے بادِ بہاری کا مفہوم پہلے پہل تب معلوم ہوا جب باجی نے اس سے حنا کی بات کی۔

اور پھر جیسے شدید حبس کے بعد تیز بارش ہو جائے، پیاس سے چٹخی زمین سیراب ہو جائے۔ حنا، زیدی چاچا کی بڑی بیٹی تھی، زیدی صاحب اس کے مرحوم والد کے بہت ہی قریبی دوست تھے، کراچی میں رہتے تھے، چند سال قبل جب وہ کراچی میں تھا تو کئی دفعہ ان کے گھر بھی گیا تھا، شائد حنا کو دیکھا بھی ہو مگر اس وقت اتنا خیال نہیں کیا تھا پھر جب اس کے پیچھے ہی پیچھے گھر والوں نے فیصلہ کر لیا، اس کی امی اور باجی نے بات چیت طے کر دی اور چھٹی میں جب وہ گھر گیا تو بس اسے یہ اطلاع دے دی گئی کہ حنا سے اس کی نسبت طے کر دی گئی ہے۔۔۔ تب اسے اپنی باجی اور امی ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگیں اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ جس

شہر میں وہ پیدا ہوا، بچپن، لڑکپن، جوانی کی منازل طے کیں، اس سے زیادہ وہ اس شہر میں جانے کے لیے بے چین ہوگیا جہاں حنا رہا کرتی تھی۔ کراچی میں اس سے قبل بھی اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی، کچھ وقت اس نے یہاں گذارا تھا۔ یہاں اس کا ایک حلقہ احباب بھی تھا، خوشگوار یادیں بھی تھیں، مگر اس شہر کے لیے اس نے اس سے قبل ایسی کشش محسوس نہیں کی تھی، حنا سے نسبت طے ہونے کے بعد اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اڑ کر کراچی پہنچ جائے۔ جہاں وہ لڑکی رہتی تھی جس کی سنگت میں اسے زندگی کا باقی سفر طے کرنا تھا۔

کسی نہ کسی طرح کہہ سن کر اس نے اپنی پوسٹنگ پھر کراچی کرالی۔ اب وہ زیدی صاحب کے یہاں جاتا تو اس کی زیادہ ہی پذیرائی ہوتی، ظاہر ہے ان کا ہونے والا داماد تھا۔ حنا سے بھی ملاقات ہوتی، ان دنوں وہ مقامی کالج سے گریجویشن کر رہی تھی، وہ دونوں بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے نزدیک آئے تھے، وہ جب تک دفتر سے فون کر کے اس کی کھنکتی ہوئی آواز نہ سن لیتا گویا اس کا دن ہی نہیں نکلتا تھا۔

''ہاں تو پیارے احمد عباس، یہی تو وہ جگہ تھی جہاں تم شادی سے قبل ایک بار اس کے ساتھ بیٹھے تھے تب تم نے اس سے مستقبل کے بارے میں کتنی ہی باتیں کی تھیں۔۔۔ تمہاری نظروں نے بارہا اس کے سراپے اور چہرے کے والہانہ بوسے لیے تھے۔۔۔ اس نے بھی تو تمہیں بارہا کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ تمہارے شوخ و شریر جملوں کو اپنی مسکراہٹوں پر روکا تھا۔۔۔ ہاں تو پیارے احمد عباس ایسا تھا کہ اس دن تم بہت خوش تھے، بہت زیادہ۔۔۔ تو پھر آج کیا ہے پیارے؟۔۔۔ حنا تو آج بھی تمہاری بیوی ہے، زندگی کے دس طویل سال تم نے اس کے ساتھ گذارے ہیں۔۔۔ پھر یہ قنوطیت۔۔۔ یہ اداسی۔۔۔ تنہائی کیسی؟؟؟؟''

دس سال پرانی بات سہی مگر اسے ایک ایک پل یاد تھا۔ جب حنا سے اس کی شادی ہوئی تو گویا اس نے اپنا سب کچھ اس کے چرنوں میں ڈال دیا۔ اس نے حنا کو ٹوٹ کر چاہا۔ اسے یہ بہت اچھا لگتا تھا کہ حنا اس کی زندگی کے لمحے لمحے میں شریک ہوگئی ہے، وہ دونوں مل کر اپنے گھر کے خواب دیکھتے۔۔۔ آنے والے بچوں کی باتیں کرتے۔۔۔ زندگی کا دکھ سکھ شیئر کرتے۔

اور پھر دن گذرتے رہے۔ احسن، احمر اور ثانیہ کی پیدائش نے دونوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ بیوی بچوں سے نزدیک رہنے کے لیے بالآخر اس نے آرمی چھوڑ دی اور کراچی میں ملازمت اور رہائش اختیار کر لی۔ حنا نے بڑی خوبی سے عباس کا گھر سنبھال لیا تھا مگر اس کا دل سنبھالنے میں اس سے چوک ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ اپنے شوہر کو سمجھ نہیں سکی تھی یا سمجھ کر انجان بن گئی تھی یا شائد اپنی آمرانہ طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ عباس کے بچوں اور اس کے گھر کی بلا شرکتِ غیرے مالکن تھی، اس کے بچے تو اس کی رعیت ضرور تھے مگر اس کی حاکمانہ طبیعت نے شوہر کو بھی اپنی رعیت سے زیادہ حیثیت نہیں دی، وہ باہمی مشاورت سے زیادہ اپنے احکامات پر عملدرآمد پسند کرتی تھی، دوسری صورت میں وہ اکثر ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔

"تو پھر یوں ہوا پیارے احمد عباس کہ اپنے گھر کی فضا کو خوشگوار رکھنے کے لیے تم اپنے خول میں واپس بند ہو گئے۔۔۔ وہی تنہائیاں اور وہی سناٹے تم نے اوڑھ لیے جو اس سے قبل تمہارے وجود کا حصہ رہ چکے تھے۔۔۔ انسان جیتے جی کہیں اپنے وجود سے بے نیاز بھی ہوا ہے احمد عباس؟۔۔۔ اور تب تم کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ تم میں ایک شخص بہادر ہے اور ایک بزدل۔۔۔"

جوں جوں وقت گذرتا گیا حنا کی شخصیت کی پرتیں اس پر کھلتی گئیں۔ شائد ہر عورت کی طرح اسے بھی اپنے گھر، بچوں اور شوہر سے شدید محبت تھی، لیکن کم از کم شوہر سے محبت، میں اسے جس والہانہ پن اور باہمی اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، وہ اس کی طبیعت کے خلاف تھا، اور اپنی مرضی کے خلاف تو وہ کچھ بھی برداشت نہیں کرتی تھی، لہٰذا ہر گھر کی طرح ان کے یہاں بھی چھوٹے چھوٹے اختلافات اٹھنے لگے، لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی، جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں، ان کے یہاں بھی ہوتے تھے، لیکن ان جھگڑوں کے نتیجے میں بالآخر حنا کی آمرانہ طبیعت اور پیچھے پڑ جانے والے طرزِ عمل نے اسے دیوار سے لگا دیا۔ اس کے اندر کا بہادر شخص چت ہو گیا اور بزدل شخص بآسانی مرعوب ہو گیا۔

"ہاں تو مرحوم و مغفور احمد عباس، بالآخر اس نے تمہیں ہاتھ جھاڑنے پر مجبور کر ہی دیا

نا؟۔۔۔اور تم جاتے بھی کہاں؟۔۔۔اپنے آبائی شہر سے تو تم خود یہاں بھاگ آئے تھے۔۔۔ بھائی سارے اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔۔۔ باجی کالے کوسوں اپنے سسرال میں تھیں۔۔۔ بظاہر تو تم بھی اپنے گھر میں خوش ہی تھے۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔۔۔ بس یہ ضرور تھا کہ کبھی کبھی تمہیں ڈپریشن کا دورہ پڑتا اور تم حنا اور بچوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہا ہوجاتے اور پھر اپنا ڈپریشن سمندر برد کرنے یہاں چلے آتے۔۔۔ جیسے آج آگئے ہو۔۔۔ تو آج آخر ایسی کیا خاص بات ہوئی پیارے۔۔۔؟"

بات عموماً کوئی خاص نہیں ہوتی تھی مگر بعض اوقات چھوٹی باتیں بھی بڑی ہوجاتی ہیں، حنا کا مزاج ایسا تھا کہ جس چیز کو وہ پسند نہیں کرتی تھی اسے اپنے گھر میں برداشت بھی نہیں کرتی تھی۔ شادی سے قبل اس کے بہت سے دوست تھے، لیکن حنا کو اس کے دوستوں کا جھمیلا پسند نہیں تھا لہٰذا اس کے دوستوں کی تعداد گھٹنے لگی اور اب تو وہ انہیں انگلی پر گن سکتا تھا، حنا کو اس کا گھر سے باہر رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا وہ اس پر زور دیتی کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت بیوی بچوں کو دے لہٰذا اس کا گھر سے نکلنا محدود ہوتا چلا گیا، نکلتا بھی تو حنا اور بچوں کے ساتھ، دوستوں کی رات گئے تک کی محفلیں خواب وخیال ہوگئیں۔

گھر کا بجٹ وہ خود بناتی تھی، لہٰذا اپنی پوری تنخواہ وہ اس کے ہاتھ پر لا رکھتا تھا اور پھر مہینے بھر اپنی ضرورت کے لیے اسی کی طرف دیکھنا پڑتا۔

ہر عورت کی طرح حنا کو بھی اپنے گھر کی خواہش تھی، جس کا وہ اکثر اظہار کیا کرتی تھی۔ اپنے گھر کی خواہش تو خود اس کے اپنے دل میں حنا سے کہیں زیادہ تھی، لیکن وہ اپنی اس خواہش کا اظہار اس لیے نہیں کرسکتا تھا کہ اپنے مالی مسائل کو سمجھتا تھا، اس نے صفر سے اپنی زندگی شروع کی تھی، لیکن اس کی لگن سچی ہی تھی، اس نے اپنی ساری جمع پونجی سے حنا کو ایک چھوٹا سا گھر بھی لے دیا تھا۔

''ہاں تو پیارے احمد عباس آج تم اسی گھر سے نکالے گئے ہو۔۔۔ اچھا تو یہ زخم ہے جو آج تم یہاں لے کر آئے ہو۔۔۔ سمندر سے شرط لگا کر رونے آئے ہو۔۔۔ تبھی تو کہا تھا

پیارے اپنی آنکھوں میں اتنے خواب نہ سجاؤ، جب ٹوٹیں تو ان کی کرچیاں تمہاری آنکھوں کو لہولہو کردیں۔۔۔تم نے حنا کی خاطر بہتوں سے کنارہ کشی اختیار کی، اور آج جب اسی حنا نے تمہیں چھوڑ دیا تو۔۔۔اکیلے پھر رہے ہو نا یوسف بے کارواں ہو کر۔۔۔؟ تم نے تو پیارے اپنی بساط کے مطابق اس کو سب کچھ دینے کی کوشش کی۔۔۔اس کے عوض تمہیں اس سے کیا چاہیے تھا؟ صرف وہ محبت اور عزت جس کے تم حقدار تھے۔۔۔لیکن اس معاملہ میں حنا کی جھولی خالی تھی۔۔۔کیوں پیارے کیوں تم وہ گھر چھوڑ آئے جس کی بنیادوں میں تمہارے خون پسینے کی کمائی شامل تھی۔۔۔؟؟؟"

بات کچھ اتنی بڑی تو نہیں تھی جس پر اس دن حنا آپے سے باہر ہو گئی تھی

"ٹھیک ہے اگر تمہیں مرا وجود اتنا ہی ناگوار ہے۔۔۔تو چلا جاتا ہوں۔۔۔"

وہ بھی آج بگڑ بیٹھا تھا۔ حنا نے اس کو نہیں روکا، وہ بھی غصے میں اٹھ گیا، بالکل بے دھیانی میں اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی تو حنا نے اس کے ہاتھ سے چابی چھین لی۔

"جہاں مرضی ہے جاؤ۔۔۔مگر یہ گاڑی تم ہرگز نہیں لے جاسکتے۔۔۔اس میں صرف تمہارا ہی پیسہ نہیں لگا ہوا ہے۔"

اس موقع پر اسے حنا سے اتنی زیادہ بدتمیزی کی توقع نہیں تھی، وہ سناٹے میں رہ گیا۔ گاڑی کی چابی حنا نے چھین لی تھی یہ تو شکر تھا اس کا والٹ، جس میں چند سو روپیے پڑے تھے، اس کی جیب میں تھا، اس نے خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"یہ گھڑی بھی تمہاری نہیں ہے۔۔۔" حنا اچانک اس کے اور دروازے کے درمیان آ گئی اس کا لہجہ انتہائی جارحانہ تھا، کمزور تو وہ بھی نہیں تھا، چاہتا تو اس کی پٹائی کر دیتا، مگر گذشتہ دس سالوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اب کیسے ہوتا۔۔۔اس نے خاموشی سے گھڑی اتار کر حنا کے حوالے کر دی اور تن کے کپڑوں میں گھر سے باہر نکل گیا۔

"تو پھر ایسا ہے احمد عباس کہ اتنی ذلت تو تم نے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔۔۔تو پھر اب جب کہ تمہارے اپنے ہی گھر کے دروازے تم پر بند ہو گئے ہیں تو یہاں کیا کرنے آئے ہو۔۔۔

خودکشی تو تم کرو گے نہیں۔۔۔ یہ بھی اچھا ہی ہے بھلا اس درجہ بزدلی بھی کس کام کی؟۔۔۔ بہت دیر ہوگئی ہے پیارے، لیکن تم جاؤ گے کہاں؟۔۔۔"

اس نے گہری سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا ساحل کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں، سیر و تفریح کے لیے آنے والے اور وہ گیند کھیلتے بچوں کا غول پتہ نہیں کب اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ساحل پر سناٹا تھا، عقب سے گذرنے والی کشادہ سڑک پر بسوں اور گاڑیوں کا شور کم سے کم ہوگیا تھا۔ سورج کب کا ڈوب چلا تھا۔ رات کی تاریکی پورے طور پر چھا چکی تھی، البتہ سمندر کا شور اور اس کے اندر کا سناٹا جوں کا توں تھا، نہ اس کے اندر کے سمندر میں درد کی لہروں کا تموج کم ہوا تھا اور نہ ہی سامنے پھیلے سمندر کی لہروں کی تندی و تیزی میں فرق آیا تھا۔ رات میں سمندر کا اپنا سحر ہوتا ہے، اندھیرے میں ڈوبے تاریک سمندر کی اونچی لہریں جب جھاگ اڑاتی ساحل کی طرف لپکتیں تو ایسا لگتا جیسے کوئی حبشی منہ پھاڑے ہنس رہا ہو۔

"بہت رات ہوگئی ہے احمد عباس۔۔۔ یہاں کب تک بیٹھے رہو گے؟؟۔۔۔ یہ مانا کہ سمندر سے تمہاری بڑی دوستی رہی ہے، مگر یہ بھی تو سوچو کہ گذشتہ کئی گھنٹوں سے تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔۔۔ خنکی بھی بڑھ گئی ہے۔۔۔ تمہیں سردی بھی لگ سکتی ہے۔۔۔ لیکن نہیں شائد ایسا کچھ نہ ہو۔۔۔ جو زخم تم نے آج کھایا ہے۔۔۔ اس کے آگے ان باتوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔۔۔ بہر حال اب اٹھو احمد عباس۔۔۔ ابھی تو بڑی عمر پڑی ہے۔۔۔ کسی اور تازہ زخم کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔۔۔ اور پیارے احمد عباس مرحوم و مغفور ایسا تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔۔۔"

وہ خاموشی سے اٹھ گیا، پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔۔۔ شہر کے مضافات کی طرف جانے والی سڑک پر ہولیا۔۔۔ یہ سڑک اس کے گھر کی طرف نہیں جاتی تھی۔

✿✿✿

۲۶/جنوری ۲۰۰۱ء

مطبوعہ سہ ماہی سفیرِ اردو، لیوٹن (اپریل-جون ۲۰۰۱ء)

# سناٹے

اچھی خاصی شاپنگ اب بھی رہتی تھی
پھیلے ہوئے کاموں کو جلدی جلدی کسی نہ کسی حد تک سمیٹ کر مومل چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔
نواز نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور بچوں کو ساتھ چلنے کے لیے آواز دی مگر بچوں میں شائد اس وقت کوئی بھی چلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تانیہ سوئیٹ ویلی میں سر گھسائے تھی، جب تک وہ ناول ختم نہ کرلیتی اس کا اعصابی نظام درہم برہم رہتا۔ فواد کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا، ایسے میں اس کا ہلنا ناممکن ہوا کرتا، سارا ٹی۔ وی کے آگے بیٹھی بلند بانگ قہقہے لگا رہی تھی، خدا جانے کون سا مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا۔ قہقہے رُکتے تو وہ نوڈلز کے لمبے لمبے ڈورے نگلنے میں مصروف ہو جاتی۔ مومل نے کالی سینڈل میں پاؤں ڈالتے ہوئے ایک بار پھر آواز دی۔

تانیہ۔۔۔فواد۔۔۔سارا۔۔۔ہم شاپنگ کرنے جارہے ہیں۔۔۔

جواب میں کمپیوٹر کی کٹ کٹ اور سارا کے قہقہوں کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا تو مومل اور نواز باہر نکل گئے۔ فلیٹ سے باہر آکر مومل کو اندازہ ہوا کہ موسم تو بہت خوبصورت تھا۔ آج سارا دن گھر میں بند رہی تھی کاموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا اور وہ تھی، ایسے میں موسم کا ہوش کسے ہوتا۔ موسم ہمیشہ اس پر اثر انداز ہوتا تھا۔ سخت اور پسینے والی گرمیوں میں وہ اچھی خاصی چڑچڑی ہو جایا کرتی تھی۔ بارشی موسم اس کے موڈ کو خوشگوار اور رومانی بنا دیتا۔۔۔ سخت سردیاں اسے خوش رکھتیں اور ابر آلود موسم اسے اداس کر جاتا۔۔۔ یہ سارے اثرات کیوں تھے اسے نہیں معلوم، مگر ہوتا عموماً ایسا ہی تھا۔

یہ سردیوں کے دن تھے، ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی، اچھا ہوا اس نے چلتے چلتے گرم پشمینہ کی شال کاندھوں پر ڈال لی تھی۔ انہوں نے جس سپر مارکیٹ میں جانے کا ارادہ کیا تھا وہ شہر سے قدرے باہر ہائی وے پر تھی۔ مومل نے ہلکے سروں میں غزلوں کا کوئی کیسٹ لگا دیا تھا، وہ خود بھی اچھا خاصا گا لیا کرتی تھی لیکن اس وقت وہ شاپنگ کی تفصیلی لسٹ پر کچھ لکھتی، کچھ کاٹتی رہی۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد جب وہ مارکیٹ پہنچے تو کہیں پارکنگ نہ ملی، سپر مارکیٹ کا اپنا وسیع وعریض پارکنگ لاٹ تھا جو اس وقت کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کئی گاڑیاں، پارکنگ کی تلاش میں چکر لگا رہی تھیں۔ نواز نے بھی دو چکر لگائے تو بیرونی جنگلے کے قریب سے نکلتی ہوئی گاڑی کی جگہ انہوں نے اپنی گاڑی گھسا دی۔

وہ ڈیڑھ دو گھنٹے شاپنگ کرتے رہے، بابا کے لیے فلاں کافی چاہیے۔۔۔ باجی نے موئسچرائزر منگوایا تھا۔۔۔ منٹو کے لے ریموٹ کنٹرول گاڑی۔۔۔ روشی نے لپ اسٹک کا کون سا شیڈ کہا تھا؟۔۔۔ مودی کی شرٹ، یہ صحیح رہے گی یا وہ۔۔۔ ایک ایک کو یاد کر کے ان کے لیے چیزیں خریدتے اور ٹرالی بھرتے رہے۔۔۔ شاپنگ سے فارغ ہوئی تو مومل اچھی خاصی تھکن محسوس کرنے لگی۔ سامان سے بھری ہوئی ٹرالی کو نواز دھکیلتا ہوا پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ گاڑی کی ڈکی کھول کر نواز نے تھیلے رکھنے شروع کیے۔ عین اسی وقت ایک سفید کرولا، جنگلے اور ان کی گاڑی کی درمیانی جگہ میں داخل ہونے لگی۔ مومل نے اگلی نشست کا دروازہ کھولنے کا ارادہ ترک کر کے اپنی گاڑی کی طرف سمٹ کر آنے والی سفید کرولا کے لیے جگہ بنائی۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان گنجائش بہت کم تھی، مومل نے اس بات کا انتظار کیا کہ سفید کرولا کے سب لوگ اتر کر نکل جائیں تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے، پچھلی نشست سے دس، بارہ برس کے دو لڑکے اترے، اوپر تلے کے بھائی لگ رہے تھے، اگلی نشستوں کے دروازے بھی کھلے، بائیں جانب سے ایک قبول صورت، صحت مند عورت اتری، اور دائیں جانب سے اترنے والا، یقیناً اس خاندان کا سربراہ رہا ہوگا، بچوں کا باپ۔۔۔ اس عورت کا شوہر۔۔۔ اس نے اچٹتی سی نظر اترنے والے پر ڈالی، جو باہر نکل کہ دروازہ بند کر کے اس میں

چابی گھما رہا تھا۔اور جیسے اس کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا ہو۔
رامق۔۔۔؟
بدن کے سناٹوں سے ابھرنے والی چیخ،اچھا ہوا کہ باہر کے شور میں دب گئی۔
دروازہ بند کر کے جب وہ مڑا تو ٹھٹک کے رہ گیا،
بدن کے سناٹوں سے ابھرنے والی یہ دوسری چیخ بھی اردگرد کے شور میں دفن ہو گئی۔
وہ اس سے چند فیٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔۔۔چند حیرت بھرے خاموش لمحے۔۔۔دو پتھر کے مجسمے۔۔۔
نواز نے گاڑی میں بیٹھ کر اندر سے اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ چونک کر اپنی گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔
اس کے ہٹنے سے جگہ بنی تو وہ شخص آہستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا،ایسے جیسے جانا نہ چاہتا ہو۔۔۔نواز نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالی اور ہائی وے پر ڈال دی۔
''کون تھا۔۔۔؟''
''کون؟''مومل چونک گئی
''وہی سفید کرولا والا۔۔۔''
''پتہ نہیں۔۔۔''
حالانکہ اس سے زیادہ کسے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ رامق تھا۔۔۔رامق۔۔۔جو کبھی اس کی زندگی سے بھی زیادہ اس کا تھا۔۔۔اور جو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب رہا تھا۔
''تم تو اسے ایسے دیکھ رہی تھیں،جیسے برسوں سے جانتی ہو۔۔۔''نواز نے یو۔ٹرن لیتے ہوئے مزید کریدا۔
''نہیں تو۔۔۔''مومل کو اپنی آواز اجنبی لگی۔
''وہ بھی تمہیں ایسے دیکھ رہا تھا جیسے۔۔۔''نواز نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''اب اس کی جواب طلبی تو اس سے ہونی چاہیے کہ آخر وہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا تھا۔''مومل نے

سنبھل کر جواب دیا اور مزید گفتگو سے بچنے کے لیے کیسٹ پلیئر چلا دیا۔

پیا ملا دے۔۔۔ پیا ملا دے

گانے کے بول اس کے اندر کی چیخوں سے ہم آہنگ ہونے لگے تو بے مقصد کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ اسی سپر مارکیٹ کے سامنے سے گذر رہے تھے، جہاں رامق اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ابھی ابھی گیا تھا۔ رامق اس شہر میں ہے۔۔۔ وہ تو انگلینڈ میں تھا۔۔۔ یہاں کب سے ہے؟۔۔۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کی بیوی رہی ہوگی۔۔۔ ماریہ۔۔۔ بچوں کو تو اس نے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔۔۔ اچھا تو اس کے دو بیٹے ہیں۔۔۔ بالکل ویسا ہی تھا، تیرہ سال تو بہت ہوتے ہیں۔۔۔ اسکا کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔۔۔ سوائے اس کے کہ کچھ سوبر سا لگ رہا تھا۔۔۔ شائد گرے بالوں کی وجہ سے۔۔۔ مگر وہ رہتا کہاں ہے؟ کیسے پتہ چلے گا؟۔۔۔ کاش اس کا فون نمبر ہی مانگ لیتی۔۔۔ مگر اسکا موقع کہاں تھا؟ نواز کی موجودگی میں یہ ٹھیک نہ ہوتا۔۔۔ وہ بھی شائد ماریہ کی وجہ سے اسے نظر انداز کر دیتا۔

اندر کے سناٹوں میں کچھ ٹوٹنے کی آواز اُبھری، شکر ہے کسی نے سنا نہیں۔

ایسا کیسے ہو جاتا ہے کہ وہ جو ہماری زندگی ہوتے ہیں، ان سے ہم لاتعلق بن جاتے ہیں۔۔۔ ایسے جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔۔۔ کچھ رشتوں کی پاسداری کرنی ہوتی ہے۔۔۔ اور شائد ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا۔

لیکن ایک تعلق تو تھا۔۔۔ ایک ایسا تعلق جو شائد کبھی کمزور نہ پڑا تھا۔۔۔ تو پھر ایسا کیسے ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کر کے گذر گئے۔

لیکن وہ دونوں تو وہیں رہ گئے تھے۔۔۔ سپر مارکیٹ کے پارکنگ لاٹ پر۔۔۔

نواز کن انکھیوں سے اس کے جذباتی اُتار چڑھاو کو دیکھتا رہا اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ اس طویل سفر میں پھر ان کے درمیان سناٹے بولتے رہے۔

---

"کون تھی۔۔۔؟" ماریہ نے سپر مارکیٹ کی طرف جاتے جاتے ٹٹولنے والے انداز میں اس سے پوچھا

''کون؟''

''وہی جس کو تم پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے۔'' اس کی آواز میں کاٹ تھی

''پتہ نہیں۔۔۔'' اُس نے جھوٹ بولا ورنہ اس سے زیادہ کسے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ مومل تھی۔۔۔ جو کبھی اس کی زندگی سے بھی زیادہ اس کی اپنی تھی۔۔۔ جو اس کی نسوں میں خون بن کر دوڑتی رہی تھی۔۔۔

جسے وہ اب تک بارش کی بوندوں میں، بادلوں کے پروں میں، اور پھولوں کی خوشبو میں تلاش کرتا رہا تھا۔۔۔

''تم تو اُسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے برسوں سے جانتے ہو۔۔۔'' ماریہ نے پھر کریدا

''نہیں تو۔۔۔'' اپنی آواز کی اجنبیت سے گھبرا کر رامق ٹرالی نکالنے لگا

''آخر وہ تمہیں ایسے کیوں دیکھ رہی تھی۔۔۔؟؟؟''

''بھئی اب یہ تو تم اس سے پوچھو۔۔۔ دیکھ وہ رہی تھی۔۔۔ جواب طلبی مجھ سے ہو رہی ہے۔''

رامق ٹرالی دھکیلتا آگے نکل گیا۔

شاپنگ کے دوران ماریہ اس سے پتہ نہیں کیا کچھ پوچھتی رہی۔۔۔ بچوں نے الگ فرمائشوں اور سوالات کی بھرمار کر رکھی تھی۔۔۔ پتہ نہیں وہ ان کی کون کون سی بات کا جواب دیتا رہا۔۔۔ اور کون سی باتیں اُسے سنائی ہی نہیں دیں۔۔۔

ان کی شاپنگ کا اختتام کسی نہ کسی ریسٹورینٹ میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس شام بھی شاپنگ کے اختتام پر وہ سب قریبی ریسٹورینٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔

''کیا تمہارے محلے میں رہتی تھی؟''۔۔۔ ماریہ نے سلاد کی پلیٹ اٹھاتے اٹھاتے پوچھا۔

''کون؟''

''وہی جو پارکنگ لاٹ پر ملی تھی۔۔۔''

''اوہ۔۔۔ خدایا۔۔۔ تم ابھی تک وہیں ہو؟''

''آخر مجھے بتانے میں کیا ہرج ہے؟'' ماریہ تلخ ہوگئی

''ارے بابا کوئی بات ہوتو بتاؤں۔۔۔یا ایسے ہی کوئی کہانی بنادوں؟'' وہ جھلاّ گیا
ماریہ چپ ہوگئی۔
تو تم اس شہر میں ہو مول۔۔۔ پتہ نہیں کب سے۔۔۔خود مجھے یہاں آئے دو سال ہو رہے ہیں۔۔۔

ان دو طویل سالوں میں تم مجھے کیوں نہیں ملیں؟۔۔۔کہاں رہتی ہو؟۔۔۔کاش تمہارا فون نمبر مانگ سکتا۔۔۔لیکن شائد نواز کی موجودگی میں یہ ٹھیک نہ ہوتا۔۔۔ہم کیسے اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے گذر گئے۔۔۔کیسا سنگین مذاق تھا۔۔۔تیرہ سال بعد تم مجھے ملیں بھی تو اس طرح کو تم سے تمہاری خیریت تک نہ پوچھ سکا۔۔۔بالکل ویسی ہی ہو۔۔۔ہاں تھوڑی سوبر ہوگئی ہو۔۔۔تم سے تو مجھے ہزاروں باتیں کرنی ہیں۔۔۔
وہ اپنے اندر کے سناٹوں سے باتیں کرتا رہا اور ماریہ گہری نظروں سے اُسے دیکھتی رہی جس کا شائد اسے زیادہ احساس نہیں تھا۔

کھانا کھا کر وہ واپس پارکنگ لاٹ کی طرف آئے۔ رات چونکہ زیادہ ہوگئی تھی لہٰذا زیادہ تر گاڑیاں جا چکی تھیں جہاں دو ڈھائی گھنٹے قبل اُنہیں پارکنگ بڑی مشکل سے ملی تھی۔ جہاں اسوقت مول کی گاڑی کھڑی تھی، اب کچھ نہیں تھا۔۔۔
وہ گاڑی میں چابی گھماتے گھماتے اُداسیوں میں شرابور ہوگیا۔
یہیں تو کھڑی تھی۔۔۔چند گھنٹے قبل۔۔۔اپنے خوشبودار وجود کے ساتھ۔۔۔
لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔۔۔سب کچھ ہواوں میں تحلیل ہو گیا تھا۔
گو کہ اس سے کوئی بات نہ ہو سکی تھی۔۔۔گو کہ وہ دل بھر کے اُسے دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ پھر بھی مطمئن تھا۔

یہ کیا کم تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے جہاں وہ رہتا ہے۔۔۔ وہ اسے پھر ملے گی۔۔۔ضرور ملے گی۔۔۔کسی پارک میں۔۔۔کسی شاپنگ پلازا میں۔۔۔نہیں تو کسی کلچرل شو میں۔۔۔کسی نہ کسی ادبی نشست میں۔۔۔وہ اُسے ڈھونڈ ھ نکالے گا۔

وہ پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال کر ہائی۔وے پر لے آیا۔

''کیا یونی ورسٹی میں تمہارے ساتھ تھی؟'' ماریہ کا لہجہ تیکھا تھا۔

''کون۔۔۔؟''

''وہی پارکنگ لاٹ والی۔''

''نہیں۔۔۔''

''تو پھر کہاں کی ملاقات ہے؟''

''تم ہی بتا دو۔۔۔ کیونکہ تمہاری ہی ضد ہے کہ میں اُسے جانتا ہوں۔۔۔ حالانکہ میں اُسے نہیں جانتا۔''

ایسا کیسے ہو جاتا ہے کہ ہم ان کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں جو ہماری رگِ جان سے بھی قریب رہتے ہیں؟ ہم انہیں کیوں نہیں گردانتے، جو ہمارا سب کچھ ہوتے ہیں۔۔۔

''تم کچھ چھپا رہے ہو۔۔۔'' ماریہ اس سے ناراض ہو گئی۔

رامق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شائد اُس نے ماریہ کی بات سنی بھی نہیں تھی اور شائد اُسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ ماریہ اُس سے ناراض ہو گئی ہے۔

اُس نے گاڑی کا کیسٹ پلیئر چلا دیا۔

آن ملو۔۔۔ اب آن ملو۔۔۔

اس کے اندر کے سناٹے بھی چیخ چیخ کر گانے لگے

سوہنی آن ملو۔۔۔ سجنا آن ملو۔۔۔

آج وہ گھر سے زبردستی نکلا تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد حسبِ معمول وہ ٹی۔ وی لاونج میں صوفے پر لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔۔۔ ماریہ اور بچوں کی شاپنگ کی ضد اُسے بری لگی تھی، مگر اٹھنا پڑا تھا۔ کتنا اچھا ہوا وہ چلا آیا۔۔۔ کاش چند گھنٹے پہلے آجاتا تو سپر مارکیٹ میں وہ اُسے متعدد بار ٹکراتی۔۔۔ ایک بار اُس سے خریت ہی پوچھ لیتا۔۔۔ فون نمبر ہی لے لیتا۔۔۔

گھر پہنچ کر وہ جلدی ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔۔۔ سونا تو کیا تھا۔ وہ کچھ وقت موڈ کے

ساتھ گذارنا چاہتا تھا۔

موبل کے ساتھ گذرے ہوئے دن کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔۔۔اسکا ہنستا مسکراتا چہرہ۔۔۔اس کا انداز۔۔۔اس کی گفتگو۔۔۔دنیا بھر کے موضوعات پراس کی باتیں۔۔۔بزلہ سنجی۔۔۔بعض اوقات کیسی دلچسپ باتیں کرتی تھی۔۔۔اُسے یاد تھا، ایک باراُس نے کہا تھا۔۔۔رامق کل میں نے لوک کہانیوں کی کتاب پڑھی، سسی پنوں۔۔۔موبل رانو، ہیر رانجھا، سوہنی ماہیوال۔ بعض باتیں بڑی غیر یقینی سی تھیں۔

''مثلاً''اس نے پوچھا تھا۔

''مثلاً ماھیوال، سوہنی سے ملنے دریا پار کر کے آتا تو اپنے ساتھ تلی ہوئی مچھلیاں لاتا۔۔۔ایک بار اُسے مچھلیاں نہ ملیں تو اُس نے اپنی ران کا گوشت بھون کر سوہنی کو کھلایا کہ وہ بھوکی نہ رہے۔۔۔ اب دیکھا جائے تو تم نے تو میرے لیئے کچھ نہ کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے، مجھے تمہاری ران کا گوشت تو نہیں چاہیئے۔۔۔ مجھے تو سری پائے چاہئیں۔''

اس پر وہ بری طرح قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

''کیوں ہنس رہے ہو خوامخوا۔۔۔''ماریہ اُسے گھور رہی تھی۔

''نہیں تو۔۔۔''وہ چور سا بن گیا۔

''کیا نیند نہیں آرہی؟''ماریہ نے پوچھا

''تم سونے دو گی تو نیند بھی آجائے گی''

''میں کون سا تمہیں جگا رہی ہوں؟ جگا تو تمہیں وہ رہی ہے جو پارکنگ لاٹ پر ملی تھی۔۔۔وہی جگا رہی ہے

وہی ہنسا رہی ہے۔۔۔میں کہاں سے آگئی بیچ میں۔''

ماریہ کہہ تو سچ ہی رہی تھی۔

''کیا نام ہے؟''

''کس کا؟۔۔۔''

''اُسی کا۔۔۔جو پارکنگ۔۔۔''

''بس بہت ہوگیا'' وہ جھلاّ گیا ''لائٹ بند کرو۔۔۔سونے دو مجھے۔۔۔''

اُس نے کروٹ بدل لی۔ بس اک رات کی بات ہے، وہ صبح منظور کو فون کرے گا۔ منظور یہاں پندرہ سال سے رہ رہا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، تارکین وطن کی کسی انجمن کا صدر تھا، تو کسی انجمن کا سکریٹری۔۔۔تارکین وطن کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا۔۔۔ وہ ضرور نواز کو جانتا ہوگا، وہ اس سے نواز کا فون نمبر لے کر کل ہی مومل سے بات کرے گا۔۔۔اس کی خیریت پوچھے گا، کرنے کی کتنی باتیں جمع ہوگئی تھیں۔۔۔ جن کو اس نے کسی سے بھی شیئر نہیں کیا تھا۔ ایسے جیسے اُسے معلوم تھا کہ ایک دن بالاخر مومل ضرور ملے گی، تب وہ اس سے سالہا سال کی باتیں بلا تکان کر سکے گا۔

''ویسے ایک بات ہے۔۔۔'' ماریہ کہہ رہی تھی۔

''کیا'' بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا

''یہی کہ اس کا شوہر تم سے زیادہ اسمارٹ، تم سے زیادہ مہذب اور تم سے زیادہ دولت مند لگ رہا تھا'' اُسے لگا جیسے ماریہ اُسے چڑھا رہی ہو۔

اُس نے کوئی جواب دیئے بغیر کروٹ بدل لی۔

---

اپنے حساب سے سارے کام سمیٹ کر جب وہ بستر پر آئی تو تھکن سے بُرا حال تھا۔ بچوں کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ غالباً ان کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ رت جگا۔۔۔خوامخواہ کا رت جگا۔

وہ بستر پر لیٹی تو رامق آ موجود ہوا۔ یہ کتنا اچھا تصور تھا کہ وہ بھی اسی شہر میں ہے۔۔۔ کتنے اچھے اور کتنے دکھی لمحے انہوں نے ساتھ گذارے تھے۔ کتنا دلچسپ تھا وہ۔۔۔ بلا کا باتونی۔۔۔ دنیا

بھر کے موضوعات پر ان کی بک بک ختم ہی نہ ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ موبل کو لانگ ڈرائیو بہت پسند ہے۔۔۔ جب وہ ڈرائیو پر ہوتے تو اسکا دل چاہتا سڑک کبھی ختم نہ ہو۔۔۔ ایسے سفر کا کوئی انت نہ ہو جس میں ہمسفر رامق ہو۔ لیکن سفر تو ختم ہوتا ہی ہے۔

ان کا ساتھ کتنا تھوڑا تھا، مگر کتنا بھرپور۔۔۔ اور جب بچھڑے تو اس بری طرح سے بچھڑے کہ برسوں ایک دوسرے کو بارش کی بوندوں میں تلاش کرتے رہے۔

''کیا نیند نہیں آرہی۔'' نواز اُس سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں زیادہ تھکن ہو تو بھی نیند نہیں آتی۔''

''سو جاؤ۔۔۔ صبح جلدی اُٹھنا ہے، اگر نیند پوری نہیں ہوئی تو طبیعت خراب ہو جائے گی'' نواز نے تاکید کی اور کروٹ بدل لی۔

''گرے ٹراپیکل سوٹ میں آج کتنا اسمارٹ لگ رہا تھا۔۔۔ کتنا کچھ ہو جاتا ہے پھر بھی ہم جیئے جاتے ہیں۔۔۔''

وہ چپ چاپ روتی رہی۔ اور صبح کے پانچ بج گئے۔

رت جگا

خواہمخواہ کا رت جگا

الارم بجنے سے قبل ہی اُس نے گھڑی کا بٹن دبا دیا اور اُٹھ گئی۔ باتھ روم میں منہ دھوتے ہوئے اُسے اپنی سرخ اور سوجی آنکھیں دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا۔

نواز پوچھے گا۔۔۔ بچے پوچھیں گے۔۔۔

کوئی بات نہیں۔۔۔ کہہ دوں گی رات نیند نہیں آئی۔

زیادہ تھکن ہو تب بھی تو نیند نہیں آتی۔

---

صبح دفتر پہنچنے کے بعد شائد سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ منظور کو فون ملایا وہ حیران تھا صبح ہی صبح رامق نے کیسے یاد کیا۔

''یار مجھے اپنے ایک دوست کی تلاش ہے، پتہ چلا ہے کہ وہ یہیں ہے۔۔۔جلد از جلد مجھے اس کا نمبر چاہیے۔''

''نام تو بتاؤ یار۔۔۔'' منصور نے کہا

''نواز۔۔۔خورشید نواز۔۔۔''

دوسری طرف سے منظور کا بلند بانگ قہقہہ سنائی دیا۔

''کیا مطلب۔۔۔کیا میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہے۔''

''یہ بتاؤ کہ نواز سے تمہاری دوستی کتنی پرانی ہے'' وہ سنی ان سنی کر کے بولا

''کافی پرانی۔۔۔کل مجھے گاڑی میں نظر آیا تھا۔۔۔لیکن شائد اُس نے مجھے دیکھا نہیں۔۔۔''

''گرے اکارڈ ہے اس کے پاس۔۔۔؟'' منظور پوچھ رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔'' رامق بے چینی سے بولا۔

''یار یہ لوگ گذشتہ دس سال سے میرے پڑوسی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے تم انہیں جانتے ہو۔۔۔'' رامق نے سکون کا سانس لیا'' مجھے ان کا فون نمبر تو لکھواؤ''

''بے کار ہے یار، اب یہ لوگ اس فون نمبر پر نہیں ملیں گے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ آج صبح کی فلائیٹ سے نواز اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا چلا گیا۔۔۔فار گڈ۔۔۔''

✪ ✪ ✪

۲۰۰۲ء

(غیر مطبوعہ)

# اسیرِ حیات[1]

بالآخر مسز محمود کا فون آ گیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ آج دوپہر تک وہ آ جائیگی، اس کا نام بشریٰ ہے، باقی بات چیت میں خود اس سے کرلوں خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ ساتویں عورت تھی جو آج آنے والی تھی، یہ تو میرے لیے مسئلہ فیثا غورث بن گیا تھا۔ مجھے اس ساتویں عورت کے بارے میں بھی کوئی خوش گمانی نہیں تھی۔ اصل میں خرابی شائد آنے والی عورتوں میں نہیں تھی، خرابی وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں آ گئی تھی۔ ایک تو میرا بڑھاپا، پھر تنہائی، بیکاری اور مستزاد معذوری اتنے بہت سارے مسائل نے میرا وجود ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

گھر میں ویسے تو میرے علاوہ راجو تھا، یہ ڈرائیور کا بارہ تیرہ سالہ لڑکا تھا، جو میں نے اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بلا لیا تھا، ڈرائیور تھا، جو میرے باہر کے کافی کام کر دیتا تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے، لہٰذا چوکیداری بھی ہو جاتی تھی، لیکن میری دیکھ بھال کرنا، کھانا پکانا، یہ مسئلہ اپنی جگہ تھا۔ میں نے اپنے سارے ملنے جلنے والوں سے کہا ہوا تھا کہ بھروسہ کا کوئی مرد خانساماں، یا بھروسہ کی کوئی عورت جو گھر کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سنبھال سکے، اگر مل سکے تو مجھے ضرور اطلاع کریں۔

گھنٹی بجی تو ڈرائیور سالم نے مجھے آ کر اطلاع دی۔ ''صاب کوئی عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''بھیج دو۔''

دوسرے ہی منٹ وہ آ گئی، اس نے داخلی دروازے پر رک کر اپنی چپلیں اُتار دی تھیں اور بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"صاب میرا نام بشریٰ ہے اور مجھے۔۔۔"

"اور تمہیں مسز محمود نے بھیجا ہے کیوں؟"

"جی صاب۔۔۔"

"ہاں بھئی بشریٰ مسز محمود نے تمہیں کام کی نوعیت تو بتا ہی دی ہوگی۔۔۔"

"نہیں صاب، انہوں نے کہا تھا کہ آپ ہی سب کچھ بتائیں گے۔"

"اچھا۔" میں تھوڑی الجھن میں پڑ گیا، یہ تو خیر میں نے دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ عورت مناسب ہے، پینتیس چالیس سال کے پیٹے میں ہوگی، غربت کے طمانچے چہرے پر نہ پڑے ہوتے تو شائد خوش شکل لگتی، صاف ستھری تھی۔ بات کرنے کا طریقہ آتا تھا۔ عورت ہے تو ظاہر ہے گھر داری بھی آتی ہی ہوگی۔

"بھئی بات یہ ہے" میں نے کہا" یہ میرا گھر ہے۔" میں نے ہاتھ پھیلا کر گھر کے دونوں طرف اشارہ کیا" اور یہ میں ہوں۔۔۔ بس یوں سمجھ لو، دونوں کو سنبھالنا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاب۔۔۔"

"میرا خیال ہے اگر تم صبح نو بجے تک بھی آجاؤ تو پانچ بجے تک واپسی ہو سکتی ہے۔ اگر تمہارا کوئی گھر ہے اور تم واپس جانا چاہتی ہو تو۔۔۔ ورنہ اوپری منزل پر ایک کمرہ خالی ہے، تم وہاں بھی رہ سکتی ہو"

"نہیں صاب میں پانچ بجے واپس چلی جاؤں گی۔"

"تمہاری مرضی۔۔۔"

اس کے بعد میں نے اس سے چند کام کی باتیں کیں، تنخواہ طے ہوئی۔ کام کی نوعیت سمجھتی رہی پھر اگلے دن آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ میں نے مسز محمود کو فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا،" آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔" میں نے مسز محمود سے کہا" بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی دور ہو مسائل تو آتے ہیں، مگر جوانی، اور ادھیڑ عمری تک بھی ان مسائل کو حل کرنے کی طاقت ہوتی ہے، لہٰذا ہم ان مسائل کو لحاف کی طرح اوڑھ نہیں لیتے، لیکن بڑھاپا کمزور ہوتا ہے، مسائل کے

خلاف ڈٹ کر کھڑا ہی نہیں ہوا جاتا، لہٰذا مسائل کا انبار کم یا ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، بالآخر انہی مسائل کو کفن کی طرح اوڑھ کر ہم ہمیشہ کے لیے سو جاتے ہیں۔" دوسری طرف سے مسز محمود کی ہنستی ہوئی آواز آئی "بھائی آپ کے فلسفے سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔"

دس برس قبل جب میری بیوی عظمٰی کا انتقال ہوا تھا، تب سے مسائل نے گویا گھر کا رستہ ہی دیکھ لیا تھا۔ انہی دنوں میں ریٹائر ہوا تھا، فوراً عظمٰی کی بیماری میں پھنس گیا، پھر عظمٰی چل بسی، تینوں بیٹے اپنے اپنے خاندانوں سمیت پُرسے کے لیے آئے، کوئی ہفتہ، کوئی دو ہفتہ رہ کر چلا گیا، تب سے میں ہوں اور میری تنہائی، مسائل کا بڑھتا ہوا انبار اور گھٹنوں کے درد کے حالیہ مسئلہ نے گویا مجھے معذور ہی کر دیا تھا۔

دوسرے دن ابھی نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ بشریٰ آ گئی۔ اسے کام سمجھنے میں اور شائد مجھے اسے سمجھنے میں چند گھنٹے لگے اور پھر وہ گویا مشین کی طرح چالو ہوگئی۔ اسے آتے ہوئے ہفتہ دس دن ہی گذرے تھے کہ ہم تینوں مرد اس پر انحصار کرنے لگے، میں، سالم ڈرائیور اور اس کا بیٹا راجو۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ہم اسی کا منہ تکنے لگتے۔ پھر جیسے وہ کہتی، ویسا ہی ہو جاتا، اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔ بشریٰ بہت کم گو تھی، خود سے کچھ نہیں بولتی تھی۔

اب یہ اس کا روز کا معمول ہو گیا تھا کہ صبح نو بجے آتی، میرے دروازے پر دستک دیتی چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دروازہ کھول کر اندر آتی، اور سیدھی باتھ روم میں چلی جاتی، وہاں کی صفائی کر کے، تولیہ وغیرہ رکھ کر باہر جاتے جاتے کہتی جاتی۔

"باتھ روم تیار ہے صاب۔۔۔" ویسے تو جمعدار آتا تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ کام اس کا ہوتا تھا،

صابن تو ختم نہیں ہو گیا؟ تولیہ میلی ہو گئی تو بدل دیتی تھی۔ میلے کپڑے اٹھا کر لے جاتی، صاف پہننے والے کپڑے نکال کر باتھ روم میں لٹکا دیتی۔ یہ بھی ضرور دیکھتی کہ فرش گیلا تو نہیں، کہ میں پھسل جاؤں اور ہڈی تڑوا بیٹھوں میں باتھ روم سے نکل کر واکر کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں جاتا تو وہ ناشتہ لگا چکی ہوتی۔ جتنی دیر میں ناشتہ کرتا وہ وہیں بیٹھی رہتی۔ تو س

سینکتی، چائے بناتی، صبح کی گولیاں نکال کر دیتی۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد میں پھر اپنے واکر کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ٹی۔وی لاونج میں آ کر بیٹھ جاتا۔ وہ ناشتے کے برتن سمیٹنے کے بعد ٹی۔وی لاونج میں آتی، میرے پیروں کے نیچے موٹا سافلور کشن رکھ دیتی تاکہ پاوں میں ورم نہ آجائے۔ تازہ اخبار لا کر دیتی، اور ٹی۔وی کا ریموٹ میرے ہاتھ میں پکڑا کر راجو کے ساتھ گھر کی صفائی میں لگ جاتی۔

اس کی یہ بڑی خوبی تھی کہ دل لگا کر کام کرتی تھی۔ فالتو نہیں بیٹھتی تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتی تھی۔ میرے گھر میں چار کمرے تھے، ایک کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا، تین بیڈ روم تھے، ٹی۔وی لاونج خاصا کشادہ تھا، اسی کے ایک طرف ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ گھر کی صفائی مکمل کر کے وہ میرے لیے ایک کپ کافی بنا کر لاتی اور تھوڑی دیر میرے پاس ہی بیٹھ جاتی۔ ایسے میں میں اس سے کوئی نہ کوئی مسئلہ ڈسکس کر لیا کرتا۔ زیادہ تر میرے طبّی مسائل ہی سامنے ہوتے۔

"مجھے لگتا ہے فزیوتھراپی سے آپ کو فائدہ ہوا ہے۔"

میرے پیروں کی حرکت سے وہ خوش تھی، کلینک سے ایک نرس آکر روز میرے پیروں کی ورزش کراتا اور مالش وغیرہ کرتا تھا۔

کبھی کہتی آج آپ کچھ سست لگ رہے ہیں، پھر خود ہی تھرما میٹر لگا کر دیکھتی بخار ہوتا تو ڈاکٹر کو فون کر کے حال بتاتی۔ دوائیں سمجھتی، سالم کو دوڑا کر دوائیں منگواتی۔

گھر کا بھی خاص خیال رکھتی تھی۔ ہر ٹوٹ پھوٹ پر اس کی نظر ہوتی۔

"آج آپ کیا کھائیں گے صاب؟۔۔۔" میرے کافی کا کپ اٹھا کر یہ اس نشست کا آخری سوال کرتی۔

"ارے بھئی اب کیا کھانا؟۔۔۔ جو تمہارا دل چاہے بنالو۔"

کھانا صرف میرے لیے نہیں بنتا تھا۔ بلکہ چاروں کے لیے بنتا تھا۔ سالم، اس کا بیٹا راجو، بشریٰ اور میرے لیے۔ میرے لیے ایک اضافی چیز وہ ضرور بناتی، کبھی سوپ، کبھی سلاد، کبھی پتلی کھچڑی،

جو مسئلہ میرے پیروں کے ساتھ تھا، وہ مسئلہ دانتوں کے ساتھ نہیں تھا۔ میری عمر ستر برس کی ہو چکی تھی لیکن میرے دانت اچھی حالت میں تھے، البتہ گھٹنوں کے درد نے زندگی تنگ کر رکھی تھی۔

پہلے وہ دوپہر کا کھانا مجھے کھلاتی، پھر میں اپنے واکر کے سہارے آہستہ آہستہ اپنے بیڈروم میں آجاتا، بعد میں وہ پھر کھانا لگاتی اب وہ تینوں کھاتے۔ پھر وہ میرے کمرے میں آجاتی۔ راجو اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ راجو میرے کمرے کے پردے برابر کر کے قدرے اندھیرا کر دیتا اور میرے پاؤں دابنا شروع کرتا۔ وہ مجھے گولیاں کھلاتی اور دروازہ بند کر کے باہر نکل جاتی۔ اس دوران وہ کچن کی صفائی کرتی۔ برتن دھوتی۔ رات کے لیے چاول یا روٹیاں بناتی۔ اور ٹھیک ساڑھے چار بجے مجھے جگا دیتی۔ میں اٹھ کر منہ دھو کر، واکر کے سہارے پھرتی۔ ٹی وی لاونج تک آجاتا۔ وہ ٹرالی دھکیلتی میرے پاس لے آتی، جس میں چائے، اور بسکٹ ہوتے یا اگر اس نے کچھ میٹھا بنایا ہوتا تو وہ بھی رکھ دیتی تھی۔ پھر راجو کو آواز دیتی۔

''راجو۔ صاب کے پاس بیٹھ۔'' راجو آکر میرے پاس بیٹھ جاتا۔ اور وہ مجھے سلام کر کے چلی جاتی۔ رات کا کھانا مجھے سالم دیتا تھا۔ میں شام میں وھیل چیئر پر ایسے ہی گھر کے لان میں گھوم پھر لیا کرتا تھا اور یا پھر کتابیں پڑھتا رہتا اور ٹی وی دیکھتا رہتا

بشریٰ کے آنے سے میری زندگی بہت آسان ہو گئی تھی۔ میرے مسائل سمٹنے لگے تھے دماغی تناؤ میں واضح کمی آگئی تھی۔ میرے دیکھنے والے بتاتے کہ میری صحت بھی اچھی ہونے لگی ہے، فزیوتھراپی سے مجھے بڑا فائدہ ہوا تھا اور اب میں واکر کے بغیر چلنے لگا تھا۔ بشریٰ نے وہ والکر اسٹور روم میں رکھ دیا تھا۔

اس دن کافی پیتے ہوئے میں نے کہا'' گھر پر رنگ روغن کو ایک طویل عرصہ گذر گیا ہے۔''

''جی ہاں۔۔۔ گھر گندا ہو رہا ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر چھتوں اور دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''رنگ کرا لیں صاب، بیگم صاب کی برسی سے پہلے۔۔۔''

میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''بیگم صاب کی برسی۔۔۔ تمہیں کس نے بتایا؟''

"سالم نے بتایا تھا جی کہ ان کا بارہ فروری کو انتقال ہوا تھا۔ اگلے مہینے ان کی گیارہویں برسی ہے۔" اُس نے کہا "ان کو کیا ہوا تھا جی؟"

"انہیں کینسر تھا۔۔۔" میں اس کو عظمیٰ کے بارے میں بتانے لگا "بہت دیر بعد تشخیص ہوا۔ ایک سال کے اندر وہ گھل کر ختم ہو گئی۔ حالانکہ میں نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مگر ہونے والی بات تھی، دسمبر میں میں ریٹائر ہوا تھا۔ کافی پیسہ ملا تھا ہم دونوں نے سوچا تھا کہ عمرہ پر جائیں گے، یوں سمجھو کہ ساری تیاریاں مکمل ہو گئی تھی۔ میڈیکل چیک اپ کے دوران ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ بتائے، وہیں سے پتہ چلا کہ اسے تو معدہ کا کینسر ہے، اس نے یہ گھر بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ بیس سال تک ہم پیسہ جوڑتے رہے تھے، میرے ریٹائرمنٹ سے دو سال قبل ہم نے یہ گھر خریدا تھا۔ پھر اس میں اس نے اپنی مرضی سے کافی تبدیلی بھی کی تھی۔ جو سیٹنگ تم اس گھر کی دیکھ رہی ہو، یہ اسی کی ہے، میں نے اس میں کوئی بھی ردوبدل نہیں کیا، سوچتا ہوں یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ جس گھر کے لیے وہ بیس برس تک رقم جوڑتی رہی، وہاں اسے صرف چوبیس ماہ رہنا نصیب ہو سکا، آخر میں تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہی اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد باہر تو ایک بار میں نے رنگ کرا دیا تھا، اندر رنگ کرانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔"

"آپ بے فکر رہیں صاب، یہ کام ہو جائے گا۔"

اور پھر واقعی یہ کام ہو گیا۔ جو مجھے ناممکن سا لگتا تھا۔ اتنا سامان کیسے ہٹایا جائے گا، رنگ روغن کے بعد صفائی کیسے ہوگی؟ سامان دوبارہ سیٹ کیسے ہوگا؟ اتنا بھاری فرنیچر، مگر بشریٰ نے راجو اور سالم کے ساتھ مل کر یہ معرکہ بھی سر کر لیا، ان دنوں میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کافی تھک جاتی تھی۔ اس کی واپسی بھی پانچ بجے کے بجائے کبھی رات آٹھ بجے ہوتی کبھی نو بجے۔ زیادہ دیر ہو جاتی تو میں سالم کے ذریعہ اسے گاڑی میں اس کے گھر بھجوا دیتا۔

رنگ روغن کا کام مکمل ہوا تو گھر میں جیسے جان پڑ گئی۔ ہر چیز صاف ستھری لگنے لگی۔

ایک دن بشریٰ مجھ سے کہنے لگی "صاب مجھے چند دن کی چھٹی مل جائے گی؟"

میری تو گویا جان ہی نکل گئی۔

”کتنے دن کی؟“

”بس صاب ایک ہفتے کی۔“

”ارے بھئی اس طرح تو بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“ میں بالکل بوکھلا گیا۔ ”چھٹی کی کیا ضرورت ہے؟“

”صاب ایک شادی ہے خاندان میں۔۔۔“

”تو کیا ہو گیا؟ شادیاں تو رات میں ہوتی ہیں۔“

”دلہن لینے دوسرے شہر جانا ہے جی۔۔۔“

مجھے مجبوراً اسے چھٹی دینی پڑی لیکن اس ایک ہفتے میں مجھے بشریٰ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا۔ سالم الٹا سیدھا جو بناتا، کھانا پڑتا۔ گولیوں کا ناغہ ہو جاتا۔ گیارہ بجے کافی کی جگہ رنگین گرم پانی ملتا۔ جس چیز پر ہاتھ رکھو گرد مٹی سے اٹی ہوتی۔ ایک بار تو باتھ روم کے گیلے فرش کی وجہ سے گرتے گرتے بچا، ایک ہفتے تک گھر میں کوئی میٹھی چیز ہی نہیں بنی۔

ایک ہفتے کے بعد جب اس کی شکل نظر آئی تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے پھر آتے ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ البتہ اب وہ جلدی جلدی تھکنے لگی تھی۔ پہلے میں نے اسے کبھی تھک کر بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب ایسا ہوتا کہ ایک کام کر کے ستانے بیٹھ جاتی۔ کبھی کبھی کونے والے بیڈروم کی قالین پر لیٹ بھی جاتی لیکن اس کے باوجود کسی کام میں تاخیر نہ ہونے دیتی۔ گھر کا نظام اسی طرح چلتا رہا اسے میرے گھر میں آئے تیسرا سال چل رہا تھا۔ ان تینوں سالوں میں اس نے ہر دفعہ بارہ فروری کو عظمیٰ کی برسی کا اہتمام کیا تھا۔ پچاس ساٹھ لوگوں کو کھانا کھلانا آسان بات نہیں تھی۔

ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کا کام بڑھ جاتا تھا کیونکہ میرا کوئی نہ کوئی بیٹا بچوں کے ساتھ تین ہفتے میرے پاس گذارنے آتا تھا۔ میرا ایک بیٹا دبئی میں جب کہ دو کینیڈا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ میرے تینوں بیٹوں، بہووں اور ان کے بچوں کے ناموں سے، پسند نا پسند سے مجھ سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ ان کے آنے سے قبل دونوں بیڈ رومز کی خصوصی صفائی ہوتی۔ ایک کمرہ بیٹا بہو کے لیے دوسرا ان کے بچوں کے لیے۔ وہ لوگ تین ہفتے

رہتے۔ اس عرصے میں میری اس سے زیادہ بات بھی نہ ہو سکتی۔ وہ بچوں کی پسند ناپسند میں گھن چکر بنی رہا کرتی۔

ان دنوں میرا منجھلا بیٹا آیا ہوا تھا جب وہ صبح نو بجے نہیں آئی۔ دس بجے اور پھر گیارہ بج گئے، جب بہو کو خود اٹھ کر ناشتہ بنانا پڑا۔ تب مجھے معاملہ کی سنگینی کا احساس ہوا۔ بہو کو نہ چائے پتی کا معلوم تھا، نہ چینی کا، کھانا پکانے کا مسئلہ الگ سر پر آ گیا، بچوں نے گھر کو کباڑ خانہ بنا دیا تھا۔ صفائی کون کرے گا، ہم سب ہونقوں کی طرح بیٹھے تھے بشریٰ کہاں رہ گئی۔ تین سالوں میں اس نے ایک دن بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ دو ماہ قبل ایک ہفتے کی چھٹی پر گئی تھی مگر اجازت لے کر۔ مجھے تو اس کا گھر بھی معلوم نہیں تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا سالم چند بار اسے گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ میں نے سالم کو بلوایا۔

"میں نے تو جی اسے کالونی کے گیٹ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اندر اتنی تنگ گلیاں ہیں کہ گاڑی نہیں جا سکے گی۔"

"تو کیا اسے کالونی میں ڈھونڈنا مشکل ہے؟" بہو نے پوچھا" اس کے شوہر کا نام معلوم ہو تو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔"

"بہت بڑی کالونی ہے جی۔ پھر مجھے اس کے شوہر کا نام بھی نہیں معلوم۔۔۔"

"اچھا چلو تم جاؤ"۔۔۔ بیٹے نے اسے فارغ کیا

"بابا کتنی عجیب بات ہے وہ تین سال سے آپ کے پاس ہے اور آپ کو اس کا گھر معلوم ہے نہ شوہر کا نام۔۔۔" بہو نے کچھ حیرت سے مجھ سے پوچھا میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ واقعی میں کیسا تھا؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ بشریٰ تھی۔ چند ہزار روپے کے عوض میرے گھر کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اور ہم سب کی ضرورت بن گئی تھی۔ اور آج اچانک غائب ہو گئی تھی۔

پانچویں دن ایک عورت آئی۔ اس کا حال خراب تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ نسرین ہے۔ بشریٰ کی بہن۔

''بشریٰ کہاں ہے؟''۔۔۔میرا پہلا سوال تھا۔

''کل وہ مرگئی جی۔۔۔''نسرین نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہیں۔۔۔''ہم سب ہکابکا رہ گئے۔

''ک۔۔۔کیسے؟''

''اس کے شوہر اور سوکن نے اسے جلا کر مار دیا جی۔۔۔اور وہ اس کی حرافہ ساس بھی تماشہ دیکھتی رہی۔۔۔''

حیرت کے مارے ہمارے منہ ہونقوں کی طرح کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''پڑوسیوں نے اسے ہسپتال پہنچایا، ہمیں تو آج پتہ چلا جب وہ مرگئی۔۔۔ہائے میری صابر بہن، پانچ دن تنہا ہسپتال میں پڑی رہی۔۔۔ہائے کاش اس کے سسرالی کتوں نے ہمیں بتادیا ہوتا میں اس کے پاس چلی جاتی۔۔۔اس کی دوا دارو تو کرتی۔۔۔اس کے حلق میں پانی تو انڈیلتی۔۔۔سب کی خدمت کرنے والی، کسی کا احسان لیے بغیر چلی گئی۔۔۔''

نسرین پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

سالم نے اسے پانی کا گلاس دیا اور اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

''کیا اس کی کوئی سوکن بھی تھی؟''

''ہمیں تو پتہ نہیں تھا جی۔۔۔دو مہینے پہلے ہی تو اس نے اپنے شوہر کی شادی کی تھی۔۔۔ہمیں بتائے بغیر۔۔۔''

مجھے یاد آیا دو ماہ قبل اس نے کسی کی شادی کے لیے چھٹی مانگی تھی۔ ہیں تو کیا یہ اس کے شوہر کی شادی کا قصہ تھا۔

''میری بہن لاولد تھی جی۔۔۔''نسرین نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا''ساس نے جینا حرام کر رکھا تھا۔ پہلے تو شوہر بشریٰ پر سوت لانے کو راضی نہ تھا، پھر ساس نے خدا جانے کیا گھول کے پلادیا کہ اپنی خالہ زاد سے شادی پر بضد ہوگیا۔ میری بہن ہی برات لے کر گئی تھی جی، یہ تو ہمیں اب پتہ چلا ہے، پڑوسیوں نے بتایا ہے، ہائے حیدرآباد اور کراچی میں راستہ ہی کتنا تھا،

ہمیں کچھ نہ پتہ چلا۔۔۔ ہماری بہن لٹ گئی۔ برباد ہوگئی۔ جل مری۔۔۔"

ہم سب سکتے کے سے عالم میں بیٹھے رہ گئے۔ پھر میں نے نسرین کے بقایاجات ادا کیے، اس کی بہن کی مدد کی غرض سے مزید کچھ رقم اس کے ہاتھ پر رکھی وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ بشریٰ کی موت میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھی لیکن شائد اس سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ میں اپنے سارے دکھ اسے دیتا رہا تھا اور اس کا کوئی دکھ نہیں اپنایا تھا۔ اس سے قبل مجھے اپنی کمینگی کا ایسا احساس نہیں ہوا تھا۔

کیا انسانوں کے بیچ ایسا ہی رشتہ ہونا چاہیے۔۔۔؟

میری بہو، مسز محمود سے فون پر کہہ رہی تھی۔ "ہم لوگ پرسوں واپس جا رہے ہیں اس سے قبل اگر کسی ملازمہ کا بندوبست ہو جائے تو اچھا ہے۔۔۔"

۞۞۞

۲۰۰۳ء

مطبوعہ ماہنامہ عفت، لاہور

# کالی

ہفتے کے سارے دن شاید ایک جیسے ہی ہوتے ہوں۔

لیکن ماروی کے لیے ایسا نہیں تھا۔ اس کے لیے تو ہر ہفتہ اور اتوار عید ہوتی تھی اور ہفتے کے باقی بے رنگ و بے کیف دن اسی عید کے انتظار میں گزرا کرتے تھے۔

اور ہفتہ کو عید اس لیے ہوتی تھی کہ اس کا شوہر بلاول گھر آجاتا تھا جو دو راتیں اور ڈیڑھ دن گزار کر پیر کی صبح ہی صبح شہر واپس چلا جاتا تھا جہاں ایک فیکٹری میں وہ ملازم تھا اور وہیں فیکٹری ہی میں ایک کمرے میں چار ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کا دل تو چاہتا تھا، چھ ماہ کی بیاہی بیوی کو اپنے ساتھ ہی رکھے، لیکن ایک تو شہر میں رہائش کے اخراجات اس کی برداشت سے باہر تھے دوسرے سب سے بڑی بات یہ کہ اماں کا حکم یہی تھا کہ ماروی ان کے ساتھ ہی رہے گی، گاؤں کی لڑکیوں کو شہر کی ہوا نہ ہی لگے تو اچھا ہے، اور اماں بہرحال اماں تھی، اس کا حکم گھر پر ہی نہیں خاندان کے بڑے حصے پر بھی چلا کرتا تھا۔ اس میں اس کی ذہانت سے زیادہ اس کی چرب زبانی، اور شر انگیزی کو دخل تھا۔

بلاول چاہتا تھا وہ جب گھر جائے تو ماروی کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے کر جائے، چوڑیاں، پراندہ، چنری یا جھمکے، لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا، اماں کے نزدیک یہ فضول خرچی تھی، تو بس پھر ایسا ہی تھا۔ لیکن ماروی کو ان باتوں سے فرق تو نہیں پڑتا تھا، وہ ہفتے کے پانچ دن چوڑیوں، پراندوں، چنری یا جھمکوں کے انتظار میں تو نہیں گزارتی تھی، وہ تو بلاول کا انتظار کرتی تھی اور جب اس کا بلاول آجاتا تھا تو اس کی کائنات مکمل ہو جاتی تھی۔

"تو مجھ سے فرمائش کیوں نہیں کرتی؟" بلاول ہر دفعہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے اس سے سوال کرتا۔
"بس جی آپ آجاتے ہو، بہت ہے۔" وہ کبھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی۔

---

چھ ماہ قبل ماروی بیاہ کر بلاول کے گھر آئی تھی، اس گھر کی وہ سب سے بڑی بہو تھی۔ بلاول سے بڑی ایک بہن تھی جو دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی، اس کے دو بچے تھے۔ بلاول سے چھوٹے دو بھائی تھے، سجاول اور شگن، یہ دونوں ماروی کے سسر کے ساتھ زمینوں پر کام کرتے تھے۔

ماروی کے ماں باپ کچے کے ایک دور پرے کے گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ بیاہ کر آنے کے بعد ایک بار اس کی ماں اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ آئی تھی، لیکن اس کے ساتھ اماں کا سلوک کچھ ایسا تھا کہ وہ بے چارے دوبارہ ادھر آنے کی ہمت نہ کر سکے، رہ گئی ماروی تو وہ ماں کے لیے تڑپتی تو ضرور تھی مگر اُس نے ایک بار بھی بلاول سے ماں کے گھر جانے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ لہٰذا رخصتی کے بعد ماں کا گھر اس کے لیے ایک بھولا بسرا خواب بن گیا۔ اور پھر خواب دیکھنے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔ اس کے پاس کون سا وقت فارغ تھا۔ یہ اماں کی جہاندیدگی تھی کہ وہ بہو کو فارغ نہ بیٹھنے دیتی، کوئی نہ کوئی کام بہو کے لیے تیار رکھتی، ماروی سارے کام خوش دلی سے کرلیا کرتی تھی۔ آخر اسے بھی تو پہاڑ سا دن گزارنا ہوتا تھا۔

پر جب بلاول آجاتا تھا، تب یہ کام اسے زہر لگا کرتے، وہ سونے جیسے دن اور ہیروں جیسی رات کا ایک اک لمحہ بلاول کے لیے پس انداز کرنا چاہتی تھی۔ ایسے میں جب ماں اُسے بار بار آواز مارتی تو اس کا جی جل جاتا، لیکن بہرحال اسے ہر بار بھاگ بھاگ کر ماں کے پاس جانا ہی پڑتا تھا۔

ایک اور جمعہ گزرا اور ہفتے کا دن چڑھا، صبح سے ہی ماروی کے کام شروع ہوگئے۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی بلاول گھر آجاتا تھا۔ ادھر ایک دو ہفتے سے وہ ماروی کو کچھ نہ کچھ پس انداز کی ہوئی رقم ضرور لا کر دیتا تھا۔ تنخواہ تو ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو گن کر اماں کے حوالے کرتا تھا، لیکن اب

وہ فیکٹری میں اوور ٹائم بھی لگاتا اور جو رقم ملتی وہ بڑے فخر سے ماروی کے حوالے کرتا۔ ماروی اسے کارنس پر دھرے قرآن مجید کے سرخ جزدان میں بنی خفیہ جیب میں رکھ دیا کرتی تھی، ضرورت کے وقت کچھ رقم گھر سے نکل آئے، کسی سے مانگنا نہ پڑے۔

ہفتے کا دن چڑھا اور ماروی کے کام شروع ہو گئے۔

وہ صبح اٹھ کر پہلے بکریوں کو چارا ڈالتی، ان کے برتن میں پانی ڈالتی۔ پھر چولہا جلاتی، رات کا بچا ہوا سالن گرم کرتی، پراٹھے پکاتی جاتی سجاول اور شگن ایک ایک کر کے وہیں باورچی خانے میں مونڈھوں پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے اور کام پر جاتے۔ صرف اس کے سسر کی پلیٹ، اس کی ساس لے کر چھپر تلے بچھے تخت پر رکھتی، اور خود بھی میاں کے ساتھ وہیں ناشتہ کرتی۔

ماروی وہیں چولہے کے آگے اپنا ناشتہ کر لیتی۔

پھر کبھی پانی بھرنے کا مرحلہ ہوتا، کبھی کپڑے دھونے کا، پھر کھانا پکانا، دن کیسے ڈھل جاتا اُسے پتا نہ چلتا۔

وہ ہفتہ کا دن تھا، اندھیرا پھیلنے سے ذرا پہلے بلاول آ گیا۔

وہ ہفتہ کو فیکٹری میں چھٹی ہوتے ہی بس پکڑتا تھا، تین گھنٹے کے سفر کے بعد اپنے گاؤں کے اسٹاپ پر اُترتا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر پہنچ جاتا۔

سارے دن کی تھکی ماندی ماروی میں دوبارا جان پڑ جاتی۔

ماروی نے لپک کر بلاول کے ہاتھ سے کپڑے کا تھیلا اور کھانے کا برتن لے لیا۔ کپڑے کے تھیلے میں اس کے دھلنے والے کپڑے تھے، جو ماروی شام میں ہی دھو کر پھیلا دیتی تھی تاکہ اگلے دن تک سوکھ جائیں۔ بلاول کے آنے سے پہلے وہ سارے کام کر چکی تھی، اور اس وقت اپنی کوٹھری میں بلاول سے جُڑی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

بلاول نے کپڑے کے تھیلے سے چند نوٹ نکال کر اُسے دیئے اور ماں کی آواز سن کر باہر چلا گیا۔ ماروی نے قرآن کے جزدان میں بنے خفیہ خانے میں وہ نوٹ رکھ دیئے۔ کل ہی وہ یہ نوٹ گن کر خوش ہو رہی تھی۔ پھر وہ بھی باہر صحن میں چلی گئی، اس کے ہاتھ میں بالٹی تھی جس میں بلاول

کے گندے کپڑے تھے، صحن کے آخری کونے میں لگے پمپ کے آگے وہ کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔
اسی وقت دیوار کی دوسری طرف سے رحیمو چاچا کی آواز آئی اور بلاول ذرا کی ذرا اُدھر چلا گیا۔
ابھی وہ کپڑوں کو رگڑ مسل ہی رہی تھی کہ گلی میں کسی کے بھاگنے کی آوز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کود آیا۔

ماروی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کود کر اندر آنے والے نے خود کو کمبل میں چھپایا ہوا تھا۔ ماروی کی چیخ سن کر اماں بھی دوڑ پڑی اور صورتِ حال دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''اے تُو کون حرامخورا ہے؟'' اماں چیخی

کود کر آنے والے نے کمبل ہٹایا۔

وہ تو سجاول تھا، اور اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر بھی!

''ہے۔۔۔ہے۔۔۔کسے مار کے آیا ہے؟'' اماں نے سینے پر دو ہتھڑ مارے۔

''سنیو لئے کو۔۔۔'' اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔

ماروی خوف سے کانپ رہی تھی، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ سنیو لیا کون تھا؟

''کوئی تیرے پیچھے تو نہیں؟'' اچانک ماں کی عقلمندی جاگ اٹھی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا ہوگا اور پولیس آگئی تو سجاول ضرور پکڑا جائے گا۔۔۔قید۔۔۔حوالات۔۔۔ پھانسی۔۔۔موت۔۔۔

ماں کے دماغ میں لاوا سا پکنے لگا، اچانک وہ ماروی کو پکڑ کر چیخنے لگی

''مار۔۔۔مارا سے۔۔۔ یہ کالی ہے۔''

سجاول ایک لمحہ کو ٹھٹک گیا لیکن فوراً ہی ماں کا منصوبہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

ماروی کے کانپتے ہاتھوں سے بلاول کی صابن لگی قمیص گر گئی۔ خوف سے اس کی چیخیں جم کر رہ گئیں۔ کیا وہ قاتلوں کے درمیان تھی؟۔۔۔ بلاول۔۔۔ بلاول کہاں چلا گیا؟؟؟

اچانک پھر گلی میں بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ ایسا لگا جیسے کئی لوگ دوڑتے چلے آرہے ہیں۔

''ہے۔۔۔کوئی ہے تیرے پیچھے۔۔۔ پولیس نہ ہو۔۔۔ ارے سوچتا کیا ہے، مار کے نکل جا۔

مار۔۔۔یہ کالی ہے۔"

ماں نے سجاول کو ماروی کی طرف دھکا دیا، اور اس نے آن واحد میں وہی چھرا ماروی پر برسا دیا، اللہ جانے دل پر ہی لگا تھا۔۔۔خون کا فوارہ پھوٹ بہا۔۔۔

ماروی کی آخری چیخیں بڑی دلدوز تھیں۔۔۔

سجاول نے دوسری طرف کی دیوار پھاند کر بھاگنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی، اماں نے چیخ چیخ کر بین شروع کر دیئے۔

پڑوسیوں کے ساتھ بوکھلایا ہوا بلاول بھی بھاگا آیا۔ماروی کی خون آلود لاش دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

اچانک ماں کے بین رُک گئے۔"کالی" کے مرنے پر کون روتا ہے؟

"کالی تھی۔۔۔" ماں نے خوامخواہ کے آنسو اوڑھنی سے پوچھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں پڑوسیوں کو بتایا تو در و دیوار چیخ اُٹھے۔

وہ کالی نہیں تھی۔۔۔

وہ تو بلاول کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔۔۔

وہ تو مقدس ماروی تھی۔۔۔

در و دیوار چیختے رہے۔۔۔سنتا کون ہے؟؟؟

☼☼☼

۲۰۰۳ء

(غیر مطبوعہ)

# سانول موڑ مہار

میں ایمبسی کی تقریب میں جانے کے لیے بالکل تیار تھا جب جاوید کا ایس ایم ایس موصول ہوا کہ اسے پہنچنے میں ابھی آدھے گھنٹے کی تاخیر ہے۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنے کا میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا لہذا میں آرام کرسی پر بیٹھ کر ریموٹ سے شغل کرنے لگا، ملکی اور غیر ملکی چینلو کی بھرمار تھی۔ میں بٹن دباتا رہا۔ کبھی کوئی بینڈ حلق پھاڑتا سامنے آجاتا، کبھی کوئی ٹاک شو میری توجہ کھینچ لیتا، کہیں خبریں نشر ہو رہی تھیں، کہیں اشتہارات چل رہے تھے، کہیں ڈرامہ تو کہیں کوئی فلم۔۔۔ جتنی تیزی سے میں چینل بدل رہا تھا اتنی ہی تیزی سے اسکرین پر منظر بدل رہے تھے، اچانک سکرین پر ایک جانی پہچانی سی شکل نظر آئی اور منظر بدل گیا، میں نے جلدی سے پچھلے چینل کے لیے بٹن دبایا، وہ پوری تمکنت، رعنائی اور وقار سے جلوہ گر تھی

شائد کسی کو انٹرویو دے رہی تھی، میں نے جلدی سے آواز بڑھائی

ہاں یہ وہی تھی۔۔۔ بالکل وہی

اروی۔۔۔ اروی قیصرانی

پتہ نہیں انٹرویو لینے والی خاتون نے کیا پوچھا تھا، بہر حال وہ اپنے مخصوص ملائمت بھرے، پر وقار لہجے میں اور من موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے رہی تھی

مجھے افسوس ہوا میں نے پہلے ٹی۔ وی کیوں نہ کھولا۔ انٹرویو لینے والی خاتون نے شائد یہ پوچھا تھا کہ اگر اس کے شوہر کی سیاسی جماعت برسر اقتدار آگئی تو خواتین کے لیے کیا کچھ کرے گی

''خواتین میں بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں'' وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی

اسے اردو بولنے میں یقیناً دقت پیش آرہی تھی لیکن حالات اور موقع محل کا تقاضا تھا کہ وہ قومی زبان میں بات کرے تاکہ عوامی حلقوں میں اس کی بات سمجھی جاسکے ''ہمیں خواتین کی ان صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، ہم ان کی تعلیم، صحت اور روزگار کے لیے جامع پروگرام بنائیں گے۔''

پاکستان میں چند ہفتوں بعد انتخابات ہونے والے تھے، جس میں اروی کا شوہر قیصرانی بھی حصہ لے رہا تھا جو وہاں کے ایک معروف سیاسی خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ تھا

انٹرویو لینے والی خاتون نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ''ہمارے ساتھ رہیے'' کہا اور وقفہ ہوگیا، اشتہارات چلنے شروع ہوگئے، میرے دماغ میں بھی ماضی کی فلم چلنے لگی

---

پندرہ سال قبل ہم نے قبرص کی ایک ہی یونی ورسٹی سے تعلیم مکمل کی تھی، ہمارا ساتھ دو سال سے زیادہ نہیں رہا تھا مگر ہم ایک دوسرے کے اچھے واقف بن گئے تھے، تاہم دونوں کے مضامین مختلف تھے وہ عربی ادبیات کی طالبہ تھی اور میں سیاسیات کا طالب علم تھا، لیکن ہمارے لازمی مضامین کی کلاسیں اکٹھے ہوتی تھیں۔ ٹسٹ یا اسائنمنٹ میں اس کی مدد کر کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی، سمیسٹر بریک پر وہ اپنے والدین کے پاس بیروت چلی جاتی اور میں اپنے والدین کے پاس دبئی آجاتا تھا۔

آخری سال، رخصت ہونے سے قبل ہم سب نے آپس میں ٹیلی فون نمبروں اور گھروں کے پتوں کا تبادلہ کیا تھا،

''کبھی بیروت آؤ تو مجھ سے ضرور رابطہ کرنا'' اس نے میری ڈائری پر اپنے ہاتھ سے اپنا ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتا لکھا تھا۔

''اور تم جب بھی پاکستان یا دبئی آؤ تو بس مجھے فون کر دینا میں خود ائرپورٹ تمہیں لینے آؤں گا'' میں نے اس کی ڈائری پر اپنا پاکستان کا اور دبئی کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ بات رسماً کہی تھی، آخر اسے پاکستان آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ اس وقت نہ مجھے معلوم تھا نہ

شائد اسے کہ آنے والے چند سالوں میں وہ پاکستانی ہو جائے گی۔

الوداعی تقریب والے دن اس نے اپنے کئی غیر ملکی دوستوں اور سہیلیوں کو اپنے ملک کے مشہور ادیب خلیل جبران کی کتابوں کا تحفہ دیا۔ مجھے بھی اس نے خلیل جبران کی کسی کتاب کا انگریزی ترجمہ دیا تھا، پتہ نہیں اب وہ کتاب کہاں تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہم سب بکھر گئے تھے۔ چند سالوں تک ہم ایک دوسرے کو موسم بہار کی آمد، یا نئے سال کی آمد کے کارڈ بھیجتے رہے، پھر یہ سلسلہ بھی خود بخود ختم ہو گیا، میری ملازمت شروع ہو گئی، پھر شادی ہو گئی، اور پھر بچے، زندگی کی مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھتی رہیں اور ماضی کو یاد کرنے کا بھی وقت نہ رہا۔ میری ملازمت دبئی میں تھی اور میں بیوی بچوں کے ساتھ وہیں مقیم تھا تاہم چونکہ والدین اور دیگر رشتہ دار کراچی میں تھے لہٰذا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

ایک بار جب کہ میں کراچی میں تھا، ملک کے ایک بڑے سیاستدان کے بیٹے قیصرانی کی شادی کی خبریں اخبارات کی زینت بننے لگیں، غیر ملکی حسین و جمیل دلہن کی تصاویر دیکھیں تو میں اچھل پڑا۔

یہ تو اروی تھی

تو گویا قیصرانی کی شادی اروی سے ہوئی تھی۔

آخر یہ کیا جوڑ تھا؟ میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ قیصرانی کا تعلق ایک سیاسی وڈیروں کے خاندان سے، اور اروی ایک تعلیم یافتہ لیکن نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی، جتنا کچھ اروی کے بارے میں مجھے معلوم تھا وہ یہی تھا کہ بیروت کے کسی بازار میں اس کے والد کی دوکان تھی، گھر کی گاڑی چلانے کے لیے والدہ کسی اسکول میں استانی تھی۔ خود وہ قبرص یونی ورسٹی میں فل برائٹ اسکالر شپ کی وجہ سے پڑھ رہی تھی۔ ایک قطعی غیر سیاسی خاندان۔ وہ تین بہنیں تھیں اور اس کا کوئی بھائی نہیں تھا، وہ سب سے بڑی تھی اور ملازمت کر کے اپنے والد کی معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ کم کرنا چاہتی تھی۔

اوہو، مجھے یاد آیا قیصرانی پچھلی حکومت کے دور میں لبنان میں پاکستانی سفیر کے عملے میں تھا، تو

وہیں کہیں اس کی اروی سے ملاقات ہوئی ہوگی۔

مجھے یہ تصور تو اچھا لگا کہ اروی ہمارے معاشرہ کا جزو بن رہی ہے مگر اس خیال سے دکھ ہوا کہ جس خاندان میں وہ گئی تھی، اس کی روایات، اقدار سب کچھ اس کے لیے انتہائی اجنبی ہوگا۔ اور پھر وڈیرہ تو وڈیرہ ہوتا ہے، کتنا ہی پڑھ لکھ جائے، شہر میں کیسی ہی شاندار کوٹھی بنا لے، وہ اپنی ذہنیت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اس بار جب میں دبئی واپس گیا تو پاکستانی اخبار پابندی سے پڑھنے لگا۔ اس سے قبل مجھے دفتر میں جو اخبار مل جاتا تھا پڑھ لیتا تھا، نہیں ملتا تھا تو نہیں پڑھتا تھا، لیکن اب میں دفتر سے گھر آتے ہوئے پاکستان سے آنے والا اردو یا انگریزی اخبار لیتا ہوا آتا تھا۔ یہاں پاکستان کے اخبار ایک دن بعد آتے تھے۔ لیکن اس سے کم از کم مجھے اروی کے بارے میں اطلاع تو مل سکتی تھیں۔ اس کا شوہر قیصرانی سیاسی طور پر بہت فعال تھا لہٰذا کبھی کبھی وہ کسی سیاسی تقریب میں اپنے شوہر یا سیاسی کارکنوں کے درمیان نظر آجاتی تھی پھر اس کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی پیدائش کی خبر بھی مجھے اخبارات سے ملیں کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ اس سے ملوں، اس سے پوچھوں کہ کیا وہ خوش ہے کیا وہ اجنبیوں کو بجن بنانے میں کامیاب ہوگئی؟ کچھ عرصے بعد میرا تجسس ماند پڑنے لگا، پھر مجھے پاکستانی اخبارات لانے بھی یاد نہ رہتے اور مجھے مہینوں اس کا خیال بھی نہ آتا۔ دن، مہینے، سال گذرتے رہے، اس کی شادی کو شائد دس سال گذر گئے تھے۔

پھر ایسا ہوا کہ جس کمپنی میں کام کرتا تھا، اس نے کراچی میں اپنا ذیلی دفتر کھولنے کا ارادہ کیا۔ امکانات کا جائزہ لینے اور کچھ ضروری ملاقاتیں کرنے کے لیے مجھے کراچی بھیجا گیا۔ یہاں آتے ہی میں بے حد مصروف ہوگیا، ان دنوں قیصرانی کی سیاسی جماعت ہی اقتدار میں تھی اور وہ خود وفاقی وزیر تھا اور اسلام آباد میں مقیم تھا تاہم اروی اپنے بچوں کے ساتھ کراچی میں ہی تھی۔ ڈیفنس میں قیصرانی کے حویلی نما خاندانی گھر میں۔

دو ہفتے کے قیام کے بعد دبئی واپس جاتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا کہ اسے فون کروں لیکن اس کی حیثیت اور مرتبہ کو دیکھ کر ہمت نہ پڑی پتہ نہیں وہ مجھے پہچانے گی بھی کہ نہیں۔

میری پیش کردہ رپورٹ پر اور کئی میٹنگوں میں مشاورت کے بعد میری کمپنی نے کراچی میں ذیلی دفتر کھولنے کی اجازت دے دی، تو یہ ذمہ داری بھی میری ہی لگائی گئی کہ ایک ماہ میں دفتر قائم کر کے رپورٹ کروں۔ میں پھر کراچی آیا اور پھر بے انتہا مصروف ہو گیا، تین ہفتوں میں برانچ آفس تیار ہو گیا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، کیوں نہ اس آفس کا افتتاح وفاقی وزیر قیصرانی سے کراؤں، اس طرح اروی سے بھی ملاقات ہو سکے گی۔ مجھے نہیں معلوم میں اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بہر حال میں نے اسے فون کیا فون اس کی سکریٹری نے اٹھایا، وہ دو منٹ تک میرا ہی انٹرویو کرتی رہی، میں کون ہوں؟ کہاں سے بول رہا ہوں؟ کس سلسلہ میں بات کرنی ہے وغیرہ وغیرہ پھر میری کال انتظار پر چلی گئی اور ایک مدھر سندھی لوک دھن میرے کانوں میں رس گھولتی رہی پھر اروی کی "ہیلو" سنائی دی

"آپ نے مجھے پہچانا؟ میں منصور بول رہا ہوں"

"منصور ۔۔۔؟" وہ رک گئی، جیسے کسی سوچ میں چلی گئی ہو

"جی میں قبرص یونی ورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھ چکا ہوں"

اس نے مجھے پہچاننے میں چند سیکنڈ لگائے اور پھر قدرے جوشیلی آواز میں بولی

"منصور ۔۔۔ منصور پاکستانی؟"

وہ یونی ورسٹی میں کبھی کبھی مجھے اسی طرح پکارا کرتی تھی۔

تو گویا چودہ پندرہ برس کے بعد بھی وہ مجھے پہچان گئی تھی

"تو کیا آپ کراچی میں ہیں؟ آپ تو شائد دبئی میں ہوتے تھے" اس نے متانت سے پوچھا، بڑی جلدی اس نے اپنی آواز پر قابو پالیا تھا

میں نے کراچی میں اس کو اپنی مصروفیت اور موجودگی کی وجہ بتائی اور پوچھا

"کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں؟"

"شیور ۔۔۔ آپ لائن پر رہیں، ابھی حنا آپ کو وقت دے دیں گی"

حنا اس کی سکریٹری تھی جس نے پہلے ہی میرا انٹرویو کر لیا تھا، حنا نے مجھے بدھ کی صبح دس بجے کا

وقت دیا۔ میں مقررہ دن، دس بجے سے کچھ پہلے ہی اس کی عالی شان کوٹھی کے باہر پہنچ گیا۔ ملازم مجھے اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر چلا گیا تھا۔ یہاں پر ہر چیز امارت، خاندانی جاہ وجلال اور شان وشوکت ٹپک رہی تھی۔ میں خوانخواہ مرعوب ہونے لگا تھا

اچانک وہ آگئی۔ میرون سوٹ پر سندھی اجرک میں وہ بہت بھلی لگ رہی تھی

''منصور۔۔۔'' وہ مسکرائی

''آپ بیٹھیے'' وہ خوش نظر آرہی تھی مگر اس کے انداز میں اس قدر وقار اور متانت تھی کہ مجھے اس سے قبل بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب وہ ایک شاندار مرصع کرسی پر بیٹھ گئی تو میں بھی کچھ فاصلے پر پڑے صوفے پر بیٹھ گیا

''اب تو آپ اچھی خاصی اردو بول لیتی ہیں'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا

''ہے نا؟'' وہ خوش ہوگئی ''کئی سال تک ٹیوٹر مجھے اردو پڑھانے آتا رہا''

اس کا واحد جمع، مونث مذکر کمزور تھا مگر پھر بھی وہ اردو ہی بولتی رہی۔ وہ میری فیملی کے بارے میں پوچھتی رہی

''نسرین اور بچے دبئی میں ہیں۔۔۔ ورنہ نسرین کو ضرور ساتھ لاتا''

کبھی ہم یونی ورسٹی کی یادیں کریدنے لگتے اور کبھی حالیہ مصروفیات پر آجاتے اسی دوران ملازم کافی اور خشک میوے لے آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری کمپنی کا برانچ آفس تیار ہوگیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا افتتاح قیصرانی صاحب سے کراوں، ''کیا آپ میرے لیے ان سے وقت لے سکتی ہیں'' میں نے پوچھا

ایک دھواں سا تھا جو اس کے چہرے پر آکر گزر گیا

''وہ اسلام آباد میں ہیں، اور آنے والے ہفتے میں بھی کراچی آنے کا کوئی ارادہ نہیں، بہرحال میں معلوم کرکے کل آپ کو فون کردوں گی''

قیصرانی کے حوالے سے ہم دونوں کے درمیان یہ پہلا اور آخری مکالمہ تھا۔ پونے گیارہ بجے کے قریب حنا دروازے پر نمودار ہوئی

''میڈم گیارہ بجے آپ کو اسکول کی تعارفی تقریب میں جانا ہے۔''

میں فوراً کھڑا ہوگیا، وہ مجھے دروازے تک چھوڑ کر اندر واپس چلی گئی میں نے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، پوچھ ہی نہیں سکتا تھا، مگر اس ملاقات میں یہ اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ اجنبیوں میں رہ رہی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود تنہا جیون جی رہی تھی۔

اس کے ساتھ کچھ تھا جو غلط تھا۔۔۔

حسب وعدہ دوسرے دن اس کا فون آگیا، معذرت کر رہی تھی کہ قیصرانی کا جلد کراچی آنے کا ارادہ نہیں ہے، اسلام آباد میں کافی مصروفیت ہے۔ اس کے تیسرے ہی دن مجھے پتا چلا کہ قیصرانی کراچی میں ہے، اخبارات میں اس کی مصروفیات کی خبروں نے مجھے حیرت زدہ کردیا۔

کیا اروی نے جھوٹ بولا تھا؟

لیکن اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟؟

مجھے تیسرے ہی دن اس سوال کا جواب مل گیا جب کمپنی کے کسی کام سے مجھے اطالوی ایمبسی جانا پڑا۔ یہ ایمبسی اروی کی کوٹھی کے بالکل مدمقابل تھی، درمیان میں صرف ایک دورویہ سڑک تھی۔ اطالوی ایمبسی میں میرا ایک دوست اشعر ہوتا تھا، اس نے مجھے فائلوں سمیت شام کو بلایا تھا، ہم دونوں ہی کاغذات میں الجھے ہوئے تھے کہ ایسا لگا باہر استقبالیہ پر کچھ گڑبڑ ہے۔ استقبالیہ اشعر کے کمرے کے بالکل برابر میں تھا، ہم دونوں ایک ساتھ باہر لپکے اور مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا وہ اروی تھی

لیکن کیا اسے اس طرح وہاں ہونا چاہیے تھا؟

وہ ننگے پاؤں تھی۔۔۔ سخت گھبرائی ہوئی۔۔۔ لیکن آخر کیوں؟؟

اسے دیکھ کر جیسا شاک مجھے لگا تھا، مجھے وہاں دیکھ کر اس سے بڑا دھکا اسے لگا تھا۔ چند سکیورٹی اہلکار۔۔۔ استقبالیہ کلرک۔۔۔ اشعر اور میں ہونقوں کی طرح کھڑے تھے۔ بالآخر وہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پا کر بولی

''کیا میں یہاں کچھ دیر رک سکتی ہوں؟''

"ت۔۔۔تشریف لایئے۔" اشعر نے ایک طرف ہوتے ہوئے اسے راستہ دیا وہ اشعر کے کمرے میں آ کر صوفہ پر بیٹھ گئی۔

"کیا میں یہاں خود کو محفوظ سمجھ سکتی ہوں؟"

اس کی آواز کے کھوکھلے پن نے مجھے ہلا دیا تھا

"آپ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہیں میڈم۔۔۔آپ تشریف رکھیں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔"

شعر لپک کر کمرے سے باہر چلا گیا، یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ پانی لانے کے بہانے حکام بالا کو اس عجیب وغریب صورت حال کی اطلاع دینے گیا ہے۔ دونوں سیکیورٹی اہلکار اشعر کے کمرے کے دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے "تو کیا وہ سفارت خانے میں پناہ لینے آئی تھی؟"

کمرے میں ہم دونوں تھے

لیکن ہم دونوں کی زبانیں گنگ تھیں

وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی، اس کی دودھ کی طرح سفید رنگت کی جلد چغلی کھا رہی تھی کہ اس پر کسی قدر تشدد ہوا ہے، گلے پر نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ تو کیا کسی نے اس کا گلا دبانے کی کوشش کی تھی؟

بائیں کلائی پر لگنے والی خراشوں پر خون جم گیا تھا۔۔۔اس کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا

دوسرے ہی منٹ اشعر، عملے کی کسی خاتون کے ساتھ اندر آیا جو بڑی ملائمت اور احترام سے اروی کو اندر لے گئی۔ اروی نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ یہ معمولی واقعہ نہیں تھا، وہ وفاقی وزیر کی بیوی تھی جو اپنے گھر سے بھاگ کر ایک سفارت خانے میں پناہ لینے آئی تھی۔ لیکن یہ بڑا واقعہ خبر نہ بن سکا، دبا دیا گیا۔

بعد میں اشعر نے مجھے اروی اور قیصرانی کے حوالے سے کچھ باتیں بتائیں جن سے میں نے اندازہ لگایا کہ قیصرانی اروی کا وہی حشر کرتا ہے جو بیشتر وڈیرے اپنی بیویوں کا کرتے ہیں۔ قیصرانی تو بلانوش بھی تھا، اشعر ہی نے مجھے بتایا کہ ایک بار اس نے گاڑی سے اروی کو کچلنے کی

کوشش کی تھی تب بھی اس نے بھاگ کر کہیں پناہ لی تھی۔ پتہ نہیں آج کیا معاملہ ہوا تھا۔
اس کے بعد اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر سے مجھے پتا چلا تھا کہ وفاقی وزیر قیصرانی کی بیوی اردنی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موسم گرما کی تعطیلات گذارنے بیروت چلی گئی ہیں۔ اس کے دو دن بعد میں بھی دبئی واپس چلا گیا تھا۔

---

اور اس وقت وہ ٹی۔وی اسکرین پر میرے سامنے تھی، وقفہ ختم ہو چکا تھا، انٹرویو لینے والی خاتون کہہ رہی تھی
''بیگم صاحبہ سیاسی معاملات پر تو کافی گفتگو ہو چکی، اب ہم کچھ آپ کی گھریلو زندگی کے بارے میں بات کریں گے۔''
''جی ضرور۔۔۔'' وہ مسکرائی تھی
''آپ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟ کیا آپ چاہیں گی کہ وہ اپنے والد کی طرح آپ کے بچے بھی سیاست میں آئیں۔''
''اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے''
''قیصرانی صاحب کیسے شوہر ہیں؟''
اک سایہ سا اس کے چہرے پر آ کر گذر گیا ''میری توقعات سے بہت بڑھ کر۔۔۔'' اس نے جواب دیا
''جھوٹ۔۔۔'' کوئی میرے اندر سے چلایا تھا
''کیا وہ آپ کو وقت دیتے ہیں؟''
''دیکھیے ایسا ہے، وہ سیاسی آدمی ہیں، وفاقی وزیر ہیں۔ ان کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔۔۔ ظاہر ہے فیملی کے لیے ان کے پاس وقت کم ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہماری خبر گیری نہیں کرتے۔''
''جھوٹ۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ جھوٹ'' میں اندر ہی اندر اُبلتا اور چلاتا رہا

''آپ کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا؟''

''جب آپ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے خود کو وقف کر دیں تو بہت سی قربانی دینی پڑتی ہے۔'' وہ حوصلے سے مسکرا رہی تھی

''سیاست میں آپ کا آئیڈیل کون ہے؟'' انٹرویو لینے والی خاتون پوچھ رہی تھی

اس نے بلا توقف، قیصرانی کے والد یعنی اپنے سسر کا نام لیا، مجھے خوامخواہ غصہ آنے لگا۔ کیا جھوٹ بولے بغیر سیاست کا کاروبار نہیں چل سکتا؟

کیا ضروری تھا کہ وہ ٹی۔ وی پر آکر اتنے سفید جھوٹ بولے، کیا وہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹی۔وی انٹرویو کو ٹال نہیں سکتی تھی؟

انٹرویو ختم ہو چکا تھا، میں نے ٹی۔وی بند کر دیا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ابھی اور اسی وقت اس کو فون کر کے پوچھوں کہ آخر اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن میں اس سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا۔ میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا، میں کچھ دیر خود کو روکتا رہا بالآخر اسے فون کر بیٹھا

''میں منصور بول رہا ہوں۔۔۔ منصور پاکستانی۔۔۔''

ایک لمحہ کی سنگین چپ کے بعد وہ تپاک سے بولی۔

''اوہو منصور۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟ کیا کراچی آئے ہوئے ہیں؟''

''نہیں میں دبئی سے بول رہا ہوں''

''خیریت؟ کیسے یاد کیا۔''

''ابھی ابھی ٹی۔وی پر آپ کا انٹرویو دیکھ رہا تھا''

''اوہو۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہاں ٹی۔ وی والوں نے بتایا تھا کہ ان کی نشریات کئی ملکوں میں دیکھی جاتی ہیں۔۔۔ آپ کو انٹرویو کیسا لگا؟''

''مجھے تو آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے''

پھر وہی لمحہ بھر کی سنگین چپ

''جی پوچھیے''

میرا جی چاہا سیدھا سیدھا سوال کروں کہ آخر اتنا جھوٹ۔۔۔ بلکہ سفید جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی لیکن میں نے خود کو کچھ اور کہتے سنا

''اروی! جب آپ بیروت چلی گئی تھیں تو پاکستان واپس کیوں آ گئیں؟''

چند لمحوں کی سنگین چپ!

''منصور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ محبوب کے گھر تک جانے والے راستوں کا سفر کبھی ترک نہ کرنا ورنہ وہاں جنگلی جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے گا اور سانپ بسیرا کر لیں گے۔''

مجھے اسے خدا حافظ کہنے کی بھی ہمت نہیں پڑی اور خاموشی سے فون بند کر دیا۔

۲۰۰۴ء

مطبوعہ ماہنامہ عفت، لاہور

# دھاندلی

اس نے افسر کو خدا حافظ کہا، اس کے ہاتھ سے اپنا چھوٹا سفری بیگ لیا، کندھے سے لٹکے پرس میں اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ ٹٹولا اور آگے بڑھ گئی۔
حیرت ہے اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا، جہاں افسر کھڑا تھا، وہ مڑ کر دیکھتی تو افسر ضرور اُسے الوداعی ہاتھ ہلاتا، جیسے گزشتہ دس برسوں سے ہوتا آیا تھا، مگر لگتا تھا کہ اس برس ایسا نہیں ہوگا۔

ہوتا ہے!

ایسا ہوتا ہے۔

ایرپورٹ کی ساری کارروائیوں سے نبٹ کر جب وہ انتظار گاہ میں آکر بیٹھی تو ابھی جہاز کی روانگی میں کچھ تاخیر تھی، رات کے بارہ بج چکے تھے لیکن انتظار گاہ، بلکہ ایرپورٹ کی پوری عمارت کے اندر دن کا سماں تھا، افسر واپس چلا گیا ہوگا، جیسا کہ اس نے آتے ہوئے راستہ میں بتایا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جلد ہی واپس چلا جائے گا، اس نے وجہ نہیں پوچھی تھی، حالانکہ پوچھنی چاہیے تھی، کیونکہ گزشتہ دس برسوں سے ایسا نہیں ہوا تھا، جب تک جہاز پرواز نہ کر جاتا تھا وہ وہیں ایرپورٹ کی بلڈنگ ہی میں رہتا تھا۔ مگر اس برس ایسا نہیں ہوا۔

ہوتا ہے،

ایسا ہوتا ہے،

ہم جیسا چاہتے ہیں، ضروری تو نہیں کہ سب کچھ ویسا ہی ہوتا چلا جائے۔

توانصر واپس جارہا ہوگا، اس نے سوچا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ واپس کیوں جارہا تھا، کل ویسے بھی چھٹی تھی، وہ آج رات، زیادہ آزادانہ چیٹنگ کرسکتا تھا، کتنی ہی لڑکیاں تھیں، کتنے ہی ای میل آئے ہوں گے، کتنے کے جواب دینے ہوں گے، اتنی مصروفیت اس کا انتظار کررہی تھی، وہ ایرپورٹ پر تضیع اوقات کیسے کرسکتا تھا۔ عجیب بات ہے، پہلے ایسا سوچ کر اس کا دل دکھ سے بھر جاتا تھا، مگر اب ایسا نہیں تھا اب یہ دکھ، نفرت میں بدل چکا تھا،

اور یہ تو گویا طے تھا کہ اب اُسے انصر سے محبت نہیں رہ گئی تھی۔ اور ایسا تو اس نے گذشتہ پندرہ سالوں میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے انصر سے نفرت ہوجائے گی۔

ہوتا ہے،

ایسا بھی ہوتا ہے،

اس سال تو وہ بالکل بھی انصر کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی، بے قدروں کے پاس جانے کا کس کو دل چاہتا ہے؟ کیا دکھ اٹھانے کے لیے بھی کوئی سفر کرسکتا ہے؟ لیکن اسے حسب سابق جانا ہی تھا، اگر نہ جاتی تو ہر چہرہ ایک سوال بن جاتا

دوسال سے انصر کیوں نہیں آیا؟

اس سال بینا کیوں نہیں گئی؟؟

انصر اور بینا کے درمیان کیا مسئلہ ہے؟؟؟

اتنے سارے سوالوں کے جواب دینے سے بہتر ہی تھا کہ وہ چند دن کے لیے ہوآتی،

ڈرامہ بازی ہی سہی!

کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات ڈرامہ بازی بھی کرنی پڑتی ہے،

بعض سچ اتنے کڑوے ہوتے ہیں کہ بولے نہیں جاتے۔۔ منہ میں چھالے پڑ جاتے ہیں

پھر اعلان شروع ہوگیا،

''کراچی جانے والے مسافروں سے درخواست ہے کہ گیٹ نمبر ۱۲ سے جہاز پر تشریف لے جائیں''

اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور چھوٹا سفری بیگ اٹھا کر گیٹ نمبر ۱۲ کی طرف بڑھ گئی، شائد
ہر مسافر نے مڑ کر الوداعی ہاتھ ہلایا تھا،
ایک وہی تھی جو مڑے بغیر، کسی کو الوداعی ہاتھ ہلائے بغیر آگے بڑھ گئی تھی،
ایسے جیسے اسے شک ہو کہ پیچھے مڑے گی تو پتھر کی ہو جائے گی۔
جہاز میں اسے ٹی۔ وی اسکرین کے بالکل سامنے والی نشست ملی تھی، اسے یہ سیٹ کبھی پسند نہیں
آئی تھی، دل چاہے نہ چاہے، سکرین پر جو کچھ چل رہا ہے، ضرور دیکھو،
اچھی دھاندلی ہے،
اس کے قریب بیٹھی خاتون نے پتہ نہیں کون سی خوشبو لگائی تھی، جو اسے سخت ناگوار لگ رہی تھی،
پچھلی نشست پر کوئی بچہ گلا پھاڑ رہا تھا، مجال ہے جو اس کی ماں نے اسے چپ کرانے کی ذرہ
برابر بھی کوشش کی ہو،
دھاندلی ہے،
یہ اچھی دھاندلی ہے کہ جو کچھ ہم سننا نہیں چاہتے، وہ سننا پڑتا ہے،
اور جو کچھ ہم دیکھنا چاہتے ہیں، وہ نظر نہیں آتا،
گذشتہ دس دن بھی تو اس نے ایسے گذارے تھے، جیسے وہ گذارنا نہیں چاہتی تھی۔
گذشتہ دس سالوں سے وہ ایسی ہی زندگی گذار رہے تھے، وہ الخبر میں تھا، جہاں اس کی ملازمت
تھی، مگر بچوں کے اسکول نہیں تھے، لہذا وہ بچوں کے ساتھ پاکستان میں تھی، بچوں کے اسکول کی
چھٹیاں ہوتیں تو وہ سب الخبر کے پاس پہنچ جاتے، پھر سیر تفریح، شاپنگ، ضیافتیں، پتہ ہی نہ
چلتا دو ماہ کیسے گذر گئے، الخبر کو بھی گھر کا ماحول مل جاتا، اس کی طرح طرح کی فرمائشیں شروع
ہو جاتیں، پائے، حلیم، گولا کباب، چنے کا حلوہ، وغیرہ وغیرہ مہینوں کی بے ترتیبی کو جیسے ایک
ترتیب مل جاتی، مکان گھر لگنے لگتا۔
چھٹیاں ختم ہوتیں تو واپسی کا سفر ہوتا
دو مہینوں کی خوبصورت یادوں کے سہارے وہ سب دس ماہ کا ہجر قبول کر لیتے۔

مگر تین سال ادھر کی بات ہے، معاملات بدلنے لگے، جب اس نے جدید ترین ماڈل کا کمپیوٹر لیا، ان دنوں وہ صرف کمپیوٹر کے فوائد پر لیکچر دیا کرتا تھا، ایسی شاندار مشین ہے جو فاصلوں کو کم کر دیتی ہے، معلومات کا ایک طوفان ہے، جو اس ڈبے سے اچھل اچھل کر نکلتا ہے، چیٹنگ کے ذریعہ دنیا بھر کے دوستوں سے رابطہ الگ ۔۔۔ پھر ایک قدم اور آگے، وائس چیٹ کی سہولت، پھر مزید ترقی، ویب کیم پر مخاطب کی شکل بھی ملاحظہ کرو،

وہ آنے والوں کو اپنے کمپیوٹر کی رونمائی کراتا تو ساتھ ہی شروع ہو جاتا

''اس طرح میں بچوں سے رابطے میں رہوں گا، فون بہت مہنگا پڑتا ہے، ای۔میل یا چیٹنگ سے میں گھنٹوں بچوں سے بات کر سکوں گا۔''

لوگ سوچتے اسے اپنی بیوی بچوں سے کس قدر محبت ہے۔

صرف وہ جانتی تھی کہ اس میں کس قدر صداقت ہے، بیوی سے زیادہ، شوہر کو کون جان سکتا ہے؟

وہ زبانی جمع خرچ کا ایک جھوٹا انسان تھا،

کھوکھلا اور سستا انسان

اور بس پھر وہ تھا اور اس کا کمپیوٹر، اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اس کی نیٹ فرینڈز اس کی پوری دنیا اس ڈبے میں سمٹ گئی تھی،

کمپیوٹر کیا تھا، ہلدی کی گرہ تھا کہ بندر بھی پنساری بن بیٹھا۔

''آپ کون سا جوس لیں گی؟ اورنج، یا مینگو۔۔۔؟'' ایر ہوسٹس اس سے پوچھ رہی تھی۔

''مشکلا۔۔۔''

''سوری میڈم'' اس نے مشکلا کا ڈبہ ہلایا ''ختم ہو گیا ہے۔۔۔ آپ مینگو لے لیں۔۔۔''

''نہیں شکریہ۔۔۔'' اس نے رکھائی سے کہا

اچھی زبردستی ہے،

مشکلا نہیں ہے، تو نہ سہی، دل چاہے نہ چاہے، مینگو لے لوں،

اور پھر یہی نہیں، وہ تو اتنا کمینہ تھا کہ مزے لے لے کر اپنی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی نیٹ فرینڈز

کے قصے دوستوں کو سناتا، لڑکیوں کے آئے ہوئے ای۔میل پڑھواتا، کمپیوٹر پر سیف کی ہوئی اس کی بعض نیٹ فرینڈز کی تصویریں تو اس نے اور بچوں نے بھی دیکھی تھیں۔

چیری۔۔۔ مائما۔۔۔ لینی۔۔۔ گریس،

اچھا خاصا بے حیا انسان تھا، اس نے نہ بیوی کی شرم کی نہ جوان ہوتی بچیوں کی۔

ادھر تین سالوں سے حالات بدل گئے تھے، اب وہ چھٹیوں میں انصر کے پاس جاتے تو اس کی پرائیوسی میں خلل پڑتا، پہلے انصر بیوی بچوں کے آنے کے دن گنا کرتا تھا، اب سوچتا تھا کہ یہ لوگ کتنے دن اور یہاں رہیں گے؟

خود اسے اپنے غیر اہم ہونے کا پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔

انصر دن دن بھر دفتر میں مصروف رہتا، گھر آتے ہی کمپیوٹر کھل جاتا، میل چیک ہوتی، نیٹ فرینڈز کے خطوط اور پیغامات دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ جاتا، پھر وہ انہیں جواب دینے میں مصروف ہو جاتا اور پھر رات گئے تک اس کی چیٹنگ چلتی رہتی،

وہ اور بچے کتنے غیر اہم ہو گئے تھے اس کے لیے۔۔۔

اور پھر ان کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ اسے اپنا حق سمجھتا تھا کہ اپنی تنہائی کے علاج کے لیے کچھ لڑکیوں سے دوستیاں کر لے،

اچھا خاصا خود غرض تھا، بلکہ کمینہ بھی۔۔۔

اسے اپنی تنہائی نظر آتی تھی، جس کے مداوے کے لیے وہ دنیا بھر میں کسی بھی لڑکی سے دوستی کر سکتا تھا،

لیکن اسے بینا کی تنہائی نظر نہیں آتی تھی۔

اندھا بھی تھا۔

پچھلے سال تو اس نے حد ہی کر دی تھی، جب اس کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو اس نے اپنی ایک نیٹ فرینڈ کے پاس ملائشیا جانے کا پروگرام بنالیا، اسے تو پتہ بھی نہ چلتا اگر اس کے دفتر کے ساتھی محمود نے، اس ملائشین لڑکی اور انصر کے درمیان، اس موضوع پر ہونے والی میل، ہیک

کر کے بینا کو فارورڈ نہ کردی ہوتی، تب بینا کو پتہ چلا کہ وہ اگلے ہفتے ملائشیا جارہا ہے، جب اس نے فون کر کے پوچھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے قبول کیا کہ ہاں وہ ملائشیا اپنے دوست ڈاکٹر احمد کے پاس جارہا ہے،

اور یہ تو وہ خوب جانتی تھی کہ مائما، اسی ڈاکٹر احمد کی مطلقہ بیٹی ہے، جس نے پورے دو ہفتے کی چھٹی لے لی ہے تاکہ انصر کو ملائشیا کی سیر کرا سکے، اس نے تو اس resort کی تصویر بھی بھیجی تھی، جہاں تین دن گذارنے کے لیے اس نے کمرہ بک کرالیا تھا۔

اگر محمود مائما اور انصر کی ہیک کی ہوئی ای میلز اور تصاویر اسے نہ بھیجتا، تو اسے انصر کے جھوٹ اور دغا بازی کا صحیح اندازہ بھی نہ ہو سکتا،

اس کے بعد اسی کمپیوٹر پر بینا اور انصر کی جنگ چلتی رہی،

دونوں طرف سے غصے بھرے بلکہ شائد نفرت بھرے خطوط کا روز آنہ تبادلہ ہوتا رہا،

یہاں تک کہ اس نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔

جب انصر کو بینا کا بھیجا ہوا کورٹ نوٹس ملا، تو کم از کم اتنا ہوا کہ وہ ملائشیا نہیں گیا مگر وہ پاکستان بھی نہیں آیا۔

بچوں کو ماں باپ کے درمیان چلنے والی اس جنگ کا پورا پورا علم تھا، لہذا جب انہوں نے چھٹیوں میں باپ کے پاس جانے سے انکار کردیا تو اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

اس نے ایک آخری موقع دینے کے لیے تنہا سفر کا ارادہ کرلیا تھا۔ اور جو دس دن اس نے انصر کے ساتھ گذارے تھے، ان کی یاد آتے ہی اس کا وجود کڑواہٹ سے بھر گیا حد ہے بے ہودگی کی!

انصر نے اس کے زخم بند نہیں ہونے دیئے۔

پچھلے ناموں میں کئی نئے ناموں کا اضافہ ہوگیا تھا، اس نے کچھ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لہذا اس کے والٹ کے اندرونی خانے میں مائما کی تصویر رکھی رہی، اس کے بریف کیس میں چیری کے ساتھ کی گئی گذشتہ عاشقانہ، بلکہ فاسقانہ تحریر کے پرنٹ آوٹ رکھے رہے، اور اس کی میز کی دراز میں میوزیکل کارڈز شور مچاتے رہے۔

دھاندلی ہے،
اچھی دھاندلی ہے،
لیکن پھراس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا۔
ایرہوسٹس کی آواز پھر آنے لگی تھی، وہی رٹے رٹائے جملے، وہی سپاٹ لہجہ
''مسافروں سے درخواست ہے کہ حفاظتی بند باندھ لیں اور سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز کریں،
اب سے کچھ ہی دیر بعد ہم کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں، اس وقت
مقامی درجہ حرارت ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ ہے، امید ہے آپ کا سفر ہمارے ساتھ خوشگوار گذرا ہوگا،
اور آئندہ بھی آپ ہمیں میزبانی کا موقع فراہم کریں گے، شکریہ اور خدا حافظ۔''
ہاں تو بینا صاحبہ الخبر کا یہ آپ کا آخری سفر تھا،
اس بار واپس آتے ہوئے اپنی ہر اہم چیز جو الخبر والے گھر میں تھی لیتی آئی تھی۔ بچوں کے کچھ
اہم کاغذات، اس کی کچھ اہم تصاویر اور کتابیں، جیولری اور ملبوسات، انصر کو اگر فرصت ہوتی تو وہ
ضرور سوچتا کہ اس بار تو بینا نے کوئی شاپنگ بھی نہیں کی تھی پھر اس کے پاس اتنا سامان کیوں تھا؟
لیکن اب بینا کے بارے میں سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا، اس بار اس نے بینا کے
آنے سے قبل کمپیوٹر کی lead نکال کر چھپادی تھی اور بینا کو یقین دلایا تھا کہ کمپیوٹر خراب ہوگیا
ہے، اس کے دفتر جانے کے بعد بینا آرام سے لیڈ لگاتی، اور کمپیوٹر پر بچوں سے رابطہ کرتی،
محمود سے اس نے انصر کا پاس ورڈ لے لیا تھا لہٰذا اس کی ساری کارستانی کمپیوٹر اسکرین پر اس
کے سامنے ہوتی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ گذشتہ پندرہ سال سے وہ کتنے جھوٹے، دغاباز اور
منافق انسان کے ساتھ رہ رہی تھی۔
کراچی ایرپورٹ پر اترتے ہی سیلی ہوئی مخصوص ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔
بیلٹ سے اپنا سامان لینے اور باہر نکلنے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا، اس نے پرس میں بند پڑے
ہوئے موبائل کو آن کیا،
ٹیکسی اسٹینڈ سے ٹیکسی لی، سامان چڑھوایا اور گھر کے لیے روانہ ہوگئی، راستے میں ہی اس کا

موبائل بجنے لگا، سکرین پر انصر کا نمبر چمک رہا تھا،
چند لمحے وہ سوچتی رہی پھر موبائل آف کر دیا
اب یہ دھاندلی نہیں چلے گی
بس اب وہ صرف وہی کچھ سنے گی، جو سننا چاہتی ہے۔

٭٭٭

۶رفروری ۲۰۰۵ء

مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور (خصوصی شمارہ، ستمبر تا مارچ ۲۰۱۰ء – ۲۰۱۱ء)

## بارے آرام سے ہیں۔۔۔

''ہاں بھئی کیا حال چال ہیں'' فون پر میاں کی آواز سنائی دی تو وہ چائے کی پیالی رکھ کر آرام سے بیٹھ گئی۔ ''سب خیریت ہے اللہ کا شکر ہے''۔ اس نے جواباً کہا:

''امی کا آپریشن ہو گیا؟''

''کل ہونا تو چاہئے تھا، مگر پورے کراچی میں بجلی کا ایسا بحران ہے کہ کچھ نہ پوچھیں، کل ہسپتال میں بھی لائٹ نہیں تھی، پندرہ آپریشن ملتوی ہوئے، امی کے لئے بھی اب دوسری تاریخ لینے جاؤں گی۔۔۔ ویسے آج صبح سے ہی بجلی نہیں ہے، کل رات بھی آدھے گھنٹے کے لئے آئی تھی، باقی سب خیریت ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔۔۔''

''احمد کہاں ہے؟'' انہوں نے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

''آرام کر رہا ہے، کل مکا چوک پر بائیک پر دو لڑکوں نے گن پوائنٹ پر اس کی گھڑی اور موبائل چھین لیا۔''

''ارے۔۔۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟''

''ہاں ہاں بالکل خیریت سے ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ اپنے احمد کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا۔۔۔ وہی کمال بھائی کا بیٹا، اس نے ذرا ہل جل کی تھی، کم بختوں نے اس کو گولی ماردی۔''

''ہیں۔۔۔'' دوسری طرف سے میاں صاحب چلائے'' کیا کہا تم نے۔۔۔ گولی مار دی؟۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے نشانہ خطا گیا۔۔۔ بچے بچ گئے۔۔۔ باقی تو سب خیریت ہے''۔

''خالدہ باجی کی طرف تو سب خیریت ہے نا؟۔۔۔'' فون پر بھی اُس نے میاں کی پھولی ہوئی سانس کا اندازہ لگالیا۔

''ہاں اب تو خیریت ہی ہے، آپ کو پتہ تو چلا ہوگا۔ ان کے میاں کا؟''

''کیوں کیا ہوا فیاض بھائی کو''

''ارے میں سمجھی تھی خالدہ باجی کی طرف سے کسی نے آپ کو فون کر دیا ہوگا، یہ جو چار دن پہلے بارشیں ہوئی تھیں کراچی میں، صدر گئے تھے بیٹے کو لینے، کرنٹ لگا وہیں ختم ہو گئے۔۔۔ اللہ کا شکر ہے بیٹا بچ گیا۔''

''اناللہ و انا الیہ راجعون۔ نہیں مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔''

''ارے ہاں میں تو بھول ہی گئی، آپ کو پتہ بھی کیسے چلتا آپ تو عمرے پر گئے ہوئے تھے۔''

''اور سناؤ گاڑی ٹھیک چل رہی ہے؟''

''چل تو ٹھیک رہی ہے، کسی نے پیچھے کا کوارٹر شیشہ توڑ کر پینل اور سی۔ ڈی چینجر نکال لیا۔''

''ہیں، یہ کب کی بات ہے؟''

''پچھلے ہفتے میں کسی دن ہوا ہے۔''

''اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟''

''کیسے بتاتی آپ تو عمرے پر گئے ہوئے تھے، ایک ہفتے بعد تو آپ سے بات ہوئی ہے، اور یہ کون سی خاص بات ہے جی، ہر سفر کی کہانی ہے۔ اللہ کا شکر ہے باقی سب خیریت ہے۔''

''تم نے گاڑی کی قسط دے دی۔۔۔ بینک میں پتہ کرو پیسے آگئے ہوں گے۔''

''جی ہاں پیسے آ بھی گئے تھے، نکل بھی گئے۔''

''کیا مطلب؟''

''بینک سے پیسے نکلوا کر آ رہی تھی، گھر تک خیریت سے پہنچ گئی، ادھر بیل پر ہاتھ رکھا، اُدھر بائک پر دو مسٹنڈے آ گئے۔ میرے پیٹ پر گن رکھ کر کہنے لگے۔ پیسے نکالو، ہمیں پتہ ہے تم بینک سے آ رہی ہو۔ ساتھ ہی انہوں نے پرس چھینا اور یہ جا وہ جا۔۔۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کتنی رقم گئی؟''

''پچاس ہزار۔۔۔شکر ہے اللہ کا میں نے پورے لاکھ نہیں نکلوائے۔''

''تم تو خیریت سے ہونا؟''

''اللہ کا شکر ہے۔ بالکل خیریت سے ہوں۔۔۔''

''رپورٹ کروائی؟''

''اللہ دشمنوں کو تھانے لے جائے، بجن کو نہیں۔۔۔''

''چلو خیر ہے، یہ بتاؤ سحر کا امتحان ہو گیا؟'' انہوں نے بیٹی کے امتحانی پرچوں کے بارے میں پوچھا

''پچھلی جمعرات کو ہونا تھا، یونی ورسٹی میں دو طلبا تنظیموں کے درمیان تصادم ہو گیا، اس کا امتحان پھر ملتوی ہو گیا اب دیکھیں کب ہوتا ہے، نئی تاریخوں کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ذرا فون سحر کو دینا۔۔۔''

''گھر پر نہیں ہے۔۔۔''

''گھر پر کیوں نہیں ہے؟'' میاں کو غصہ آ گیا ''میرا خیال ہے کراچی میں اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔''

''جی ہاں بج تو ساڑھے گیارہ رہے ہیں، بے فکر رہیں، اپنی پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ ایکسپو سینٹر گئی تھی، وہ لوگ ٹریفک جام میں پھنس گئے ہیں، میرا موبائل پر ان سے رابطہ ہے، اُمید ہے رات دو تین بجے تک گھر آ ہی جائیں گے۔''

''منظور کی بائیک کا پتہ چلا؟'' انہوں نے چھوٹے بھائی کی خبر لینی چاہی۔

''روز تھانے کے چکر لگا تو رہا ہے۔ چلیں جی، بائیک گئی تو گئی، اللہ کا شکر ہے منظور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

''اور آپ خیریت سے ہیں؟'' اس نے میاں سے پوچھا

اچانک پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بجلی پھر چلی گئی تھی، کاڈلیس کی یہی تو خرابی ہے، لائٹ جائے تو فون بھی بند ہو جاتا ہے۔

چلیں جی، باقی تو سب خیریت ہے نا۔

اللہ کا شکر ہے، اہلِ کراچی خیریت سے ہیں۔

✪ ✪ ✪

۲۰۰۹ء

(غیر مطبوعہ)

# سودا

مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنا ارادہ بدلنا چاہتا تو بھی بدل نہیں سکتا تھا۔ جارج کے جانے کے بعد وہ مزید اس کمرے میں نہیں رہ سکتا تھا، اسے جارج کے حصے کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہر چند اس نے مارتھا سے بات کی تھی کہ اگر جارج اچانک چلا گیا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ لیکن مارتھا نے اسے کرخت آواز اور جھلائے ہوئے لہجے میں جتا دیا تھا کہ اسے پورا کرایہ چاہیے اگر جارج چلا گیا ہے تو یہ اس کا مسئلہ نہیں۔

مارتھا اس بلڈنگ کی مالکن تھی۔ موٹی، بھدی، چڑچڑی اور واہیات عورت، وہ گذشتہ چار سالوں سے یہاں رہ رہا تھا اور مارتھا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لندن کے مشہور ساحلی شہر کی یہ ایک غریب بستی (Slum) تھی، جس کے آخری کونے پر مارتھا کی یہ تنگ عمارت تھی، جس کا کوئی نام نہیں تھا، مارتھا کی بلڈنگ کہلاتی تھی، اس کا ہر کمرہ کرائے پر اُٹھا ہوا تھا اس دومنزلہ عمارت میں صرف ایک کچن تھا، جس میں سب مختلف اوقات میں اپنا کھانا پکاتے یا گرم کرتے تھے، ہر منزل پر ایک ایک غسلخانہ اور ایک ہی بیت الخلاء تھا، جسے عورتیں اور مرد سب استعمال کرتے تھے۔

وہ بطور کرایہ دار مارتھا کی اس بلڈنگ میں چار سال سے رہ رہا تھا۔ اس تمام عرصہ میں اس نے کبھی کوئی کمرہ دو دن سے زیادہ خالی نہیں دیکھا۔ شائد ہی کسی کمرے میں کوئی تنہا کرایہ دار رہتا ہو، زیادہ تر ایک کمرہ کئی کرایہ داروں میں سانجھا تھا، جیسا کہ وہ اور جارج بھی ایک کمرہ شیئر کرتے تھے، تاکہ کرایہ نصف دینا پڑے۔ مارتھا کرایوں کے حساب میں بڑی تیز تھی، وہ ہفتہ واری کرایہ وصول کرتے ہوئے کسی کو شمہ برابر رعائت دینے کی روادار نہ تھی، اس حوالے سے

شائد ہر کرایہ دار سے اس کی بک بک جھک جھک ہو چکی تھی۔

چار سال قبل جب وہ جارج کے کہنے پر اس کمرے میں آیا تو اس کے دو مزید دوست براون اور ایڈی بھی اس کمرے میں رہتے تھے، مائیکل کے آنے سے وہ چار ہو گئے اور کرائے کا بار بھی ہلکا ہو گیا۔ دس فٹ طول اور بارہ فٹ عرض کے اس سیلن زدہ کمرے کا رنگ روغن اڑ چکا تھا، زمین پر پڑا قالین جگہ جگہ سے ادھڑ رہا تھا، کھڑکی کا پردہ خدا جانے کتنے سالوں سے نہیں بدلا گیا تھا، اور شائد ان باتوں سے ان چاروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے لیے اہم بات یہ تھی کہ کمرے کا کرایہ چار افراد میں تقسیم ہونے سے ہر ایک کا بوجھ بڑا ہلکا ہو گیا تھا۔

چند ماہ پہلے ہی براون اور ایڈی ڈرگ وغیرہ کے چکر میں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور انہیں جیل ہو گئی تھی۔ جارج اور مائیکل پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی، اس لیے نہیں کہ انہیں جیل ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ دوسرے ہی دن ہفتہ واری کرایہ وصول کرنے کے لیے مارتھا کو آدھمکنا تھا اور دونوں کو دوگنا کرایا دینا تھا۔

دو دن قبل جارج اچانک غائب ہو گیا تھا۔ گویا اب پورے کمرے کا کرایہ مائیکل کے سر پہ آ رہا تھا۔ یہ صورت حال اسے کسی طور پر قابل قبول نہیں تھی۔ جارج کے غائب ہو جانے کا مارتھا نے بہت سخت نوٹس لیا تھا۔ مارتھا کا کمرہ بلڈنگ کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ جہاں سے وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتی تھی، جارج کے جانے کے بعد مارتھا نے مائیکل پر خاص نظر رکھی ہوئی تھی، ایسا نہ ہو کہ مائیکل بھی کرایہ دیے بغیر سرک لے لیکن شائد مائیکل کے لیے یہ آسان نہ ہوتا کیونکہ وہ اپنا سامان، جس میں ایک گدا، دو کشن، ایک چرمی سوٹ کیس اور ایک پرانا ٹائپ رائٹر شامل تھا، یہاں چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا، اور نہ اتنا سامان لے کر مارتھا کی نظروں سے بچ کر نکل سکتا تھا۔

آج ہفتہ تھا اور چھٹی کا دن تھا۔ مائیکل مارتھا کی بلڈنگ سے نکل کر پورے سلم کا دو چکر لگا چکا تھا۔ تین پونڈ ہفتے پر کہیں بھی کمرہ شیئر پر بھی نہیں مل رہا تھا، البتہ کسی نے اسے ڈیوڈ کے بارے میں ضرور بتایا تھا، اس نے اپنے فلیٹ کا ہر کمرہ کرایہ پر اٹھایا ہوا تھا، خود لاونج میں پڑا رہتا

تھا۔ دو دن قبل ہی اس کے فلیٹ کا ایک کمرہ خالی ہوا تھا۔ مائیکل بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا اس عمارت تک پہنچ گیا جس میں ڈیوڈ کا فلیٹ تھا۔ اس نیم تاریک، سیلن زدہ، بے رنگ و روغن کی اس پرانی عمارت کے عقبی دروازے کے اندر اس نے قدم رکھا تو ایک لمحے کے لیے اسے رکنا پڑا۔ اندر سیڑھیوں پر نیم تاریکی تھی۔ اس وقت کوئی بلب بھی نہیں جل رہا تھا۔ اگر وہ اس عمارت سے مانوس ہوتا تو اندازے سے سیڑھیاں چڑھ جاتا، لیکن وہ پہلی بار یہاں آیا تھا، اچانک اسے جیب میں پڑی چھوٹی ٹارچ کا خیال آیا اور اس نے ٹارچ جلائی۔

ڈیوڈ کا فلیٹ پہلی منزل پر داہنی جانب تھا، جس کے لیے اسے اٹھارہ سیڑھیاں چڑھنی تھیں، اچانک وہ ٹھٹک گیا، پندرھویں، سولھویں سیڑھی پر کوئی بیٹھا تھا، اس نے ٹارچ کی شعاع اس شخص پر ڈالی، وہ کوئی لڑکی تھی، جس نے تھوڑا سمٹ کر اسے گذرنے کا راستہ دے دیا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گذر کر مزید دو سیڑھیاں چڑھ گیا۔ داہنی جانب ڈیوڈ کا فلیٹ تھا، گہرے رنگ کا دروازہ جس کا پینٹ جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ مائیکل کی دوسری گھنٹی پر دروازہ کھل گیا، دروازہ کھولنے والا ڈیوڈ ہی تھا، مائیکل کا مدعا سن کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کا کہا۔

چھوٹا سا لاونج اَنمل بے جوڑ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ یہ لاونج ہی اس کا بیڈروم بھی تھا کچن بھی تھا اور ٹی وی لاونج بھی تھا۔ ڈیوڈ کالے لیدر کے بھدے سے صوفہ پر دھنس کر وہ سوپ پینے لگا جو غالبًا مائیکل کے آنے سے قبل اس نے اپنے لیے بنایا تھا۔ گو کہ وہاں ایک دو بے جوڑ کرسیاں اور بھی پڑی تھیں لیکن اُس نے مائیکل کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ بجّو جیسی آنکھوں والا، تھلتھلاتے وجود کا فضول سا آدمی تھا۔

''میرے پاس کرائے پر چڑھانے کے لیے ایک کمرہ خالی ہے، سڑاپ۔۔۔'' وہ بڑی بدتمیزی سے سوپ پی رہا تھا۔ ''کیا تمہیں چاہیے؟'' اس نے ڈرامائی انداز میں بھنویں اچکائیں۔

''کیوں نہیں۔۔۔ میں اسی کی تلاش میں تو آیا ہوں''۔

''کیا تم تنہا رہو گے، یا تمہارے ساتھ کوئی پارٹنر بھی رہے گا۔۔۔ سڑاپ۔۔۔''

''ابھی تو میں تنہا ہی ہوں، مگر کرایہ کیا ہے؟''

"کمرہ کا کرایہ۔۔۔سر! اپ آٹھ پونڈ ہفتہ ہے۔۔۔"

مائیکل کے گلے میں گولا سا پھنس گیا، اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مائیکل باہر نکلا تو وہ لڑکی اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔ مائیکل کو ٹارچ جلانے کی ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ اس کی آنکھیں اس ملگجے پن کی عادی ہو گئی تھیں۔ وہ اس لڑکی کے پاس سے گذرا تو اس نے پوچھا۔

"کیا معاملہ طے ہو گیا؟"

"نہیں۔۔۔" مائیکل چند سیڑھیاں نیچے رک گیا۔

"کیوں؟"

"کرایہ زیادہ ہے"

اس لڑکی نے گہری سانس لی اور آہستہ سے بولی "ہاں کرایہ بہت زیادہ ہے۔"

"کیا تم بھی اسی لیے یہاں آئی تھیں؟" مائیکل نے پوچھا

"ہاں"

"تو اگر تمہارے لیے بھی کرایہ زیادہ ہے تو یہاں اندھیرے میں بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟"

"مجھے ابھی دو گھنٹے اور یہیں بیٹھنا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ڈاون ٹاون جانے والی بس رات آٹھ بجے جائے گی"

مائیکل نے کندھے اچکائے اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ بھی کچھ سوچ کر اٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے عمارت سے باہر آ گئے۔ باہر کی روشنی میں مائیکل نے اس پر تفصیلی نظر ڈالی۔ وہ تیئیس چوبیس سال کی خوبرو لڑکی تھی، لیکن حالات کی ستائی ہوئی، اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی، دکھ اور تفکرات کے آثار بہت گہرے تھے۔ شائد کچھ دیر پہلے وہ روئی بھی تھی۔ اس نے ایک پرانی جینز کے اوپر پھولدار ٹاپ پہنی ہوئی تھی۔ جو موسم کے اعتبار سے کافی ہلکی تھی، اسے سردی لگ سکتی تھی،

ہوسکتا ہے اس کے ہونٹ عام حالات میں اتنے نیلے بھی نہ ہوں۔ اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔

عمارت سے باہر آتے ہی وہ تھڑے پر بیٹھ گئی تھی۔ شائد کھڑے ہونے میں کمزوری محسوس کررہی ہو، پتہ نہیں اس نے کھانا کب کھایا تھا۔۔۔ یا شائد نہ کھایا ہو۔ مائیکل اس کے قریب ہی کھڑا، بڑی دیدہ دلیری سے اس کا معائنہ کررہا تھا، اور اندازے لگا رہا تھا۔ اچانک اس نے مائیکل سے پوچھا۔

''کیا تم میری ایک مدد کرسکتے ہو؟''

''شائد۔۔۔ لیکن تمہارا نام کیا ہے؟''

''روز۔۔۔'' اس نے اپنے کندھے سے لٹکے ہوئے بڑے سے چرمی بیگ میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کیا اور ایک زنانہ گھڑی نکالی

''کیا تم یہ گھڑی دو پونڈ میں مجھ سے خرید سکتے ہو؟''

مائیکل کو گھڑیوں کی خاک بھی پہچان نہیں تھی، پھر بھی وہ چشمہ ماتھے پر ٹکا کر بغور گھڑی کا معائنہ کرنے لگا پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے گھڑی روز کو واپس کردی۔

''یہ دو پونڈ کی تو نہیں ہے۔''

''یہ میں نے سیل (Sale) سے پانچ پونڈ میں لی تھی'' روز نے زور دے کر کہا۔

''تمہیں دو پونڈ کیوں چاہئیں؟''

''میرے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔''

''تم عجیب احمق لڑکی ہو، جب تمہارے پاس واپسی کا کرایہ نہیں تھا تو تم ڈاون ٹاون سے یہاں آئی کیوں تھیں؟''

''مجھے رہنے کے لیے جگہ چاہیے تھی'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا'' اسی لیے میں اپنا سامان بھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔''

اس کا سامان اس کے چرمی بیگ میں تھا، بیگ بہت پرانا، بدرنگ لیکن مضبوط تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ مجھے کمرہ ضرور مل جائے گا''

''کیوں'' مائیکل نے تیوری چڑھائی، اب وہ بھی اس کے قریب تھڑے پر بیٹھ چکا تھا۔
''کیا یہ فلیٹ تمہارے باپ کا ہے جو ضرور تمہیں کرائے پر مل جائے گا؟''
''ہے تو میرے باپ کا ہی۔'' روز نے آہستہ سے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ میں ڈیوڈ کی بیٹی ہوں۔۔۔ اکلوتی بیٹی۔۔۔''
''ہیں۔۔۔'' مائیکل تھوڑا ہونق سا ہو گیا
''میں نے بابا سے کہا تھا کہ میں پانچ پونڈ ہفتے سے زیادہ نہیں دے سکتی، لیکن وہ فکر نہ کرے میں جلد ہی اپنی کسی سہیلی کو اپنے ساتھ رہنے پر راضی کرلوں گی، اس طرح ہم دونوں مل کر آٹھ پونڈ ہفتہ کرایہ دے دیں گے، لیکن بابا کو میری بات کا اعتبار نہیں آیا۔''
اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
دونوں کے درمیان سنگین خاموشی چھا گئی۔ ورنہ گلی میں تو شور تھا۔ گلی کے ایک کونے پر بنی کچرا کنڈی کے گرد کھیلتے ہوئے بچوں کے شور میں اب شام کو گھر لوٹنے والے پرندوں کا شور بھی شامل ہو رہا تھا۔ اس سلم کی گلیوں میں کئی گھنے اور بوڑھے درخت تھے جن پر نہ جانے کتنی چڑیوں کا بسیرا تھا۔ ان چڑیوں کے کتنے مزے تھے جس درخت کی جس شاخ پر چاہو گھونسلا بنالو، نہ سیکیورٹی ڈپازٹ، نہ ہفتہ واری کرایہ۔۔۔
خزاں کا موسم اپنے عروج پر تھا، پوری گلی میں پیلے اور کتھئی سوکھے پتوں کی تہہ سی بچھی ہوئی تھی۔ گلی سے کوئی گذرتا تو پیروں کے نیچے کچلے جانے والے سوکھے پتے شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔
''ایک آفر میں تمہیں دے سکتا ہوں'' مائیکل نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''وہ کیا؟'' روز بے ساختہ بولی ''کیا تم گھڑی خریدنے پر آمادہ ہو گئے ہو؟ یقین مانو یہ گھڑی دو پونڈ میں تم کو کہیں سے نہیں ملے گی، آخر تم یہ گھڑی اپنی بیوی کو کرسمس کا تحفہ۔۔۔''
''میں گھڑی خریدنے نہیں جا رہا۔'' مائیکل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پھر۔۔۔؟''

''پھر یہ کہ ڈاون ٹاون کے لیے اگلی بس صبح سات بجے جائے گی۔تم چاہو تو یہ رات میرے ساتھ گذار لو، صبح میں تمہیں دو پونڈ دے دوں گا۔''

روز نے پہلی بار چونک کر مائیکل کو غور سے دیکھا۔

پتلا دُبلا، لجلجلا سا، ہونق سا آدمی، کھوپڑی پر جہاں تہاں کوئی سفید کوئی کتھئی بال، بھدے سے فریم کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی دو خود غرض آنکھیں جسم پر انمل بے جوڑ لباس، سگریٹ سے جلے ہوئے سیاہ ہونٹ اور پیلے پیلے دانت۔۔۔منحوس مارا،خناسی بڈھا۔۔۔

روز نے ناگواری سے منہ پھیر لیا، مائیکل نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور واپسی کے ارادے سے چل پڑا۔

''میں مارتھا کی بلڈنگ میں پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۳ میں رہتا ہوں''۔

مائیکل جاتے جاتے اسے اطلاع دے گیا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد چرمراتے پتوں کا شور بھی تھم گیا۔

---

رات کے سوا آٹھ بجے ہوں گے جب مائیکل کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مائیکل اسی دستک کے انتظار میں تھا، ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نے دروازہ کھول دیا۔آج پہلی بار جارج کے نہ ہونے کا اسے کوئی غم نہیں تھا۔دروازے پر روز کھڑی تھی۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ صبح تم مجھے تین پونڈ دے دو؟'' وہ کمزور آواز میں پوچھ رہی تھی۔

''سوری۔۔۔بس دو پونڈ۔۔۔'' مائیکل نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔روز چند لمحے تک گومگو کی حالت میں دروازے پر کھڑی رہی، پھر مائیکل کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

✡ ✡ ✡

۴ر جولائی ۲۰۱۰ء

مطبوعہ ماہنامہ الحمرا، لاہور

# نو وار ڈاٹ کام

# (No War.com)

گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ منظر کی تبدیلی کا شدید خواہاں تھا، لیکن اسے معلوم تھا کہ منظر نہیں بدلے گا، وہ گھر پہنچے گا تو درو دیوار سے برستی وحشتیں ہی اس کا استقبال کریں گی، سوزن کے ہوتے ہوئے بھی جان لیوا خاموشی اسے کھانے کو دوڑے گی، لاونج ویران پڑا ہوگا، شائد ٹی۔وی چل رہا ہو اور شائد دیکھنے والا کوئی نہ ہو، صوفوں پر پڑے ہوئے کچھ الٹے سیدھے میگزین، دیوار کے ساتھ کونے میں لگی ہوئی چار افراد کی چھوٹی سی ڈائننگ میز پر پڑے ہوئے صبح کے کچھ جھوٹے برتن، لاونج کے مشرقی گوشے میں وہ اسی طرح کمپیوٹر کے آگے بیٹھی ہوگی، ہوسکتا ہے اس نے ہاتھ لیا ہو، ہوسکتا ہے نہ لیا ہو، نہ کپڑے بدلے ہوں، وہی براؤن پھولوں والا سلیپنگ گاؤن، وہی الجھے ہوئے بے ترتیب بال،

''پریشان کن۔۔۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''سخت پریشان کن۔۔۔''

وہ چار سیڑھیاں چڑھ کر داخلی دروازے پر پہنچا، دروازے کے سوراخ میں چابی گھمائی، اور اندر داخل ہوگیا۔

منظر کی تبدیلی کی خواہش کہیں ٹھٹھر کر مرگئی، وہی ملگجا اندھیرا، داہنے ہاتھ پر بنے ہوئے چھوٹے سے کچن میں موت کا سا سناٹا، نہ برتنوں کا جلترنگ، نہ پکے ہوئے کھانے کی خوشبو۔۔۔ لاونج میں ٹی۔وی چل رہا تھا، مگر دیکھنے والا کوئی نہ تھا، لاونج کے مشرقی گوشے میں البتہ کمپیوٹر کی

سکرین چمک رہی تھی، جس کے آگے سوزن بیٹھی تھی، وہی براؤن پھولوں والا سلیپنگ گاؤن، وہی حلیہ جو وہ صبح چھوڑ کر گیا تھا،

اُس کی تھکن بڑھنے لگی،

مشینی انداز میں اس نے سوئچ دبایا تو گھر روشن ہو گیا، سوزن نے چونک کر سر اٹھایا،

''کم تم آ گئے......'' اسکا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

کم نے اس کی عقب میں پہنچ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر بائیں گال پر خیر مقدمی بوسہ دیا یہ گویا جواب تھا کہ ''ہاں میں آ گیا۔''

کم کے سامنے کمپیوٹر سکرین تھی، جس پر داہنے گوشے پر اوپر کی جانب جان کی ہنستی ہوئی تصویر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوزن کوئی متن میل کر رہی تھی ماس میلنگ...... اس کا پورا وجود تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

کم اسے اسی طرح چھوڑ کر گردن میں پھنسی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کچن میں چلا گیا، کچن کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ صبح کے ناشتہ کے بعد نہ چولہا جلا تھا، نہ برتن دھلے تھے، نہ کھانا پکا تھا۔

کیا وہ فون کر کے کھانا منگوا لے یا ساسجز اور چپس پر گزارہ کر لے،

''کیا کھاؤ گی؟'' اس نے سوزن سے پوچھا تو جیسے اسے کچھ خیال آ گیا، وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی، کم فریش ہونے کے خیال سے باتھ روم چلا گیا۔ بیڈروم بھی ویسا ہی پڑا تھا، جیسا وہ صبح چھوڑ کر گیا تھا، اسکا مطلب یہ تھا کہ سوزن جو دوپہر میں کچھ دیر سونے کی عادی تھی، آج دوپہر سوئی بھی نہیں تھی،

جنگ نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔

چند ماہ پہلے تک ان کی زندگی کتنی خوشگوار تھی، سوزن سے اس کی شادی کو پندرہ سال ہو رہے تھے، گو کہ وہ شادی سے پہلے پانچ سال اکٹھے رہے تھے جس کے نتیجے میں ان کا ایک بیٹا جان اور ایک بیٹی روز تھی۔ شادی کے بعد انہوں نے مزید بچے پیدا نہ کرنے کا فیصلہ کیا، دو بچے ان کے

لئے کافی تھے، سوزن گھریلو عورت تھی، شروع میں جب بچے نہیں تھے، وہ کبھی کوئی چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب کرلیا کرتی تھی، بچوں کی پیدائش کے بعد وہ ایک اچھی ماں کی طرح گھر کی ہورہی تھی، وہ محبت کرنے والی بیوی اور مہربان ماں تھی، جب اسے اچھی طرح یہ اندازہ ہوگیا تھا تو اس نے سوزن سے شادی کرلی تھی، اس وقت جان چار سال کا اور روز دو سال کی تھی۔

ان کی بیٹی روز دو سال قبل، جبکہ وہ اٹھارہ سال کی ہوگئی تھی، اپنے علیحدہ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئی تھی، جان فوج میں چلا گیا تھا، اور صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرتا تھا۔ زندگی کے اس مرحلہ میں اب پھر وہ اور سوزن رہ گئے تھے۔

لیکن جنگ بڑی ظالم تھی، جس نے بہت سارے گھروں کو قبرستان بنادیا تھا۔

نہانے کے بعد اس نے بیڈروم کو درست کیا، اور لاونج میں ٹی۔وی کے آگے پڑے صوفے پر دھنس گیا، کچن سے اٹھنے والی خوشبو بتارہی تھی کہ شائد سوزن اس کے لئے جھینگوں والے چاول بنارہی ہے۔

یہ وہی سوزن تھی جو اس کے آنے سے قبل گھر صاف ستھرا کردیتی تھی، کھانا ہمیشہ تیار ہوتا تھا، بلکہ وہ خود بھی تیار ہوتی تھی، کم کے آنے پر وہ دونوں اکھٹے چائے پیتے تھے، ایسے میں وہ گھر کے بنے ہوئے بسکٹ یا کیک رکھنا نہ بھولتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ ان کا دن کیسا گزرا۔ خاص طور سے جب روز یا جان کا فون آیا ہوتا، تو اس کے لئے لازمی ہوتا کہ وہ اپنے اور روز کے مابین یا اپنے جان کے مابین ہونے والی گفتگو کا ایک ایک مکالمہ اسے سنائے۔

سوزن اونچی آواز میں میوزک سنا کرتی تھی، خاص طور سے جتنی دیر وہ کچن میں ہوتی، میوزک کی تھاپ پر کام کرتی، گلوکار یا گلوکارہ کی آواز کا پورا پورا ساتھ دیتی، ایسے میں اگر فون کی گھنٹی بجتی تو کم کو پہلے بھاگ کر میوزک کی آواز کم کرنی پڑتی اور پھر وہ ریسور اٹھاتا۔ جب تک بچے بھی ساتھ رہتے تھے، گھر کی رونقیں عروج پر تھیں۔ اب جبکہ دونوں بچے دور تھے پھر بھی سوزن کی رونق کم نہ تھی،

کیا یہ وہی سوزن تھی؟؟؟

جنگ نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔

''سوزن صرف ہمارا بیٹا ہی جنگ پر نہیں گیا ہے، ہزاروں جوان گئے ہیں......'' آج کھانے پر پھر کم اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا تھا، جب سے جان جنگ پر گیا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح اسے سمجھاتا ہی رہا تھا۔

''ہوں......'' سوزن کی آواز مری ہوئی تھی۔

''جنگ جب شروع ہوتی ہے تو بالآخر ختم بھی ہوجاتی ہے'' کم کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ جنگ جلد ختم ہوجائے گی اور جان واپس آجائے گا۔''

سوزن کی آنکھ میں ایک لمحہ کو چمک لہرائی پھر مایوسی تیرنے لگی،

''مجھے یہ جنگ ختم ہوتی نظر نہیں آرہی، تمہیں خبریں دیکھنے کا وقت نہیں ملا ہوگا، سارے ہی اہم دفاعی تجزیہ کار بتا رہے ہیں کہ جنگ فیصلہ کن مرحلہ میں ہے، اور یہ جنگ مکمل فتح تک جاری رکھی جائے گی۔''

''ہوسکتا ہے فتح قریب ہو..............''

''میں نے اگلے مظاہرے کے لئے ٹیکس میل کر دیا ہے''۔ سوزن نے گویا سنی ان سنی کر دی، ''یہ مظاہرہ اتوار کو رکھا ہے، کیا اب تم اس میں شریک نہ ہوگے؟'' اتوار کو ہونے والے مظاہرہ میں وہ سوزن کے ساتھ تھا مگر، کم اور سوزن کے لئے لینڈا کی عدم شرکت تکلیف دہ تھی۔ لنڈا جان کی گرل فرینڈ تھی، سوزن نے جان کے لئے جو سائیٹ بنائی تھی اس کو سب سے پہلے اس نے ہی جوائن کیا تھا، شروع میں وہ کبھی کبھار سوزن کو فون بھی کر لیتی تھی، سوزن نے کمپیوٹر پر ان ماؤں اور رشتہ داروں کا ایک فورم بنالیا تھا جن کے بیٹے یا رشتہ دار جنگ پر بھیجے گئے تھے، اور جو جنگ نہیں چاہتے تھے وہ جو اپنے بیٹوں اور جوانوں کی واپسی چاہتے تھے۔ اس فورم کو سوزن ہی ہیڈ کرتی تھی، مظاہروں کا پروگرام بھی وہی بناتی تھی، سائیٹ پر تصویریں پوسٹ کرتی، جنگ بند کرنے کے لئے مضامین لکھتی اور لکھواتی، سرکاری عہدہ داروں کو خطوط ای۔ میل کرتی غرضکہ وہ سارا دن اس میں لگی رہتی تھی۔ لنڈا پہلے مظاہرے میں شریک ہوئی تھی۔ اب دوسرے مظاہرے

سے غائب تھی۔
آزمائشوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ پہچانے جاتے ہیں۔
جنگ بھی ایسی ہی ایک آزمائش تھی۔

---

اسی ہفتے کم کے معمولات میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی، انجلینا کوپر نے حال ہی میں کمپنی جوائن کی تھی، اسے انجلینا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک زندہ دل، خوش شکل عورت تھی، عمر شائد اس سے چند سال زیادہ ہو، اس نے اس ویک اینڈ پر اسے ڈنر کی دعوت دی تھی۔ جو اس نے قبول کر لی تھی۔ اس ہفتے کھانے پر انجلینا نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا، اس کے شوہر کا دو سال قبل گاڑی کے حادثے میں انتقال ہو چکا تھا، انشورنس کی خاصی رقم اسے ملی تھی، شوہر کی طرف سے ملنے والی رقم سے اس نے نواح میں ایک گھر خرید لیا تھا، جہاں وہ اپنی ملازمہ کے ساتھ رہتی تھی، اس کی ایک ہی بیٹی تھی، جو شادی شدہ تھی اور کسی دوسرے اسٹیٹ میں رہتی تھی، اور یہ کہ انجلینا نے اسے بتایا کہ اس نے کم جیسے مرد کم دیکھے ہیں اور یہ کہ وہ اسے پہلی ہی نظر میں پسند کرنے لگی تھی۔ لیکن کم کسی اور ہی دنیا میں رہتا تھا۔
ڈنر پر سے رات گئے کم جب گھر آیا تو خلافِ توقع سوزن نے اس سے تاخیر کا سبب نہیں پوچھا کم اپنے کمرے میں سونے چلا گیا اور سوزن نے اس سے کھانے کا بھی نہیں پوچھا۔
سوزن کی سائیٹ نووار ڈاٹ کام کے اب تک سینکڑوں ممبر بن چکے تھے۔ آج اس کے فورم میں شامل ایک ماں الزبتھ کا جواں سال بیٹا میدانِ جنگ میں کام آ گیا تھا، الزبتھ نے پیدائش سے لے کر جواں سالی تک کی اپنے بیٹے کی تصاویر سائیٹ پر پوسٹ کی تھیں، آخری تصویر تابوت میں بند اس کی لاش کی تھی!
انہیں دیکھ کر وہ بڑی دلگرفتہ تھی، ایک اور ماں کا بیٹا زخمی حالت میں واپس آ چکا تھا، اور اب ہسپتال میں داخل تھا، اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، جو بارودی سرنگ کی وجہ سے اڑ گئی تھی، اس کا نفسیاتی علاج بھی چل رہا تھا۔

دو ہفتے بعد سوزن نے اسے بتایا کہ وہ نیویارک جا رہی ہے، کم کو اس کے ساتھ چلنا چاہئے، امریکی صدر کی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ آمد کے موقع پر وہ مظاہرہ کریں گے" ان مظاہروں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" کم سوزن کو سمجھاتا رہا،"ہم حکومت کی نظروں میں آچکے ہیں، تمہیں محتاط رہنا ہوگا، تمہاری سائیٹ بلاک بھی کی جاسکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا" سوزن نے اعتماد سے کہا "ہم نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے، ہم جنگ کے مخالف ہیں، اور یہ پیغام سب کو دینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے یہ غیر ضروری لگتا ہے......" کم نے مایوسی سے سر ہلایا۔

سوزن نے اپنے نیویارک جانے کے پروگرام کا فورم پر اعلان کیا، لیکن ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ تھا، کم نے بھی انکار کر دیا تھا، وہ چھٹی نہیں کر سکتا تھا یا شائد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سوزن نے روز کو بھی فون کر کے اپنا پروگرام بتایا جو چھ ماہ سے نیویارک ہی میں رہ رہی تھی اور اسے دعوت دی کہ وہ مظاہرہ میں اس کے ساتھ چلے لیکن روز نے اسے بتایا کہ اس دن وہ ڈیوڈ کے ساتھ نارتھ کیرولینا جا رہی ہے، دو دن اس کے والدین کے ساتھ گزارے گی، روز نے بڑے جوشیلے انداز میں سوزن کو اطلاع دی تھی کہ وہ گرمیوں میں شادی کرنے جا رہے ہیں۔

سوزن نیویارک چلی گئی۔

کم نے انجلینا کو بتایا تو اس نے کم کو اپنے گھر مدعو کر لیا۔ دو دن اور دو راتیں انجلینا جیسی زندگی سے بھرپور عورت کی معیت میں گزار کر جب کم واپس آیا تو سوزن کی نیویارک سے واپسی میں چند گھنٹے باقی تھے، اسے ایسا لگا جیسے جنگ سے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔

جب وہ انجلینا کی زلفوں اور باہوں میں کھویا رہا تھا، تو ٹی وی پر ایک تنہا عورت کو دکھایا گیا تھا۔ جس نے ہاتھ میں ایک بینر اٹھا رکھا تھا اس پر لکھا تھا "جنگ نہیں امن" ساتھ ہی ایک نوجوان کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی اور ظاہر ہے کہ یہ اس کا اکلوتا جوان بیٹا جان تھا۔

دوسری سطر میں لکھا تھا "ہمارے بیٹے کب واپس آئیں گے؟" اور تیسری سطر میں اس کی سائیٹ کا نام تھا، نو وار ڈاٹ کام۔

سکیورٹی والوں نے اس عورت کو بہت پیچھے ہی روک لیا تھا، ورنہ اس کا ارادہ صدر کو ایک یادداشت پیش کرنے کا بھی تھا، لیکن نہ ہی وہ یادداشت پیش کر سکی، نہ ہی اسے اتنا آگے آنے دیا گیا کہ صدر مملکت کی کم از کم اس پر نظر ہی پڑ سکتی لیکن میڈیا نے اسے بار بار دکھایا، وہ تنہا عورت سوزن تھی!

گھر واپس آنے کے بعد پھر وہ تھی، اسکی سائیٹ اور اسکی مصروفیات،

''سوزن تم مجھے بالکل وقت نہیں دیتی ہو، تمہیں نارمل زندگی میں واپس آجانا چاہئے، میرے لیے یہ قابل قبول نہیں ہے کہ تمہارا سارا وقت سائیٹ کے لیے گزرتا ہے۔'' اس دن کھانے پر پھر کم نے قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں اس سے کہا،

''یہ میرا مشن ہے۔'' سوزن کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

''لیکن اس سے ہماری گھریلو زندگی ختم ہو چکی ہے۔''

''تمہیں اس مشن میں میرا ساتھ دینا چاہئے۔''

''اب تک تو دیا تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں مزید تمہارے ساتھ نہ چل سکوں گا۔''

سوزن نے غور سے اسے دیکھا، اور خاموش رہی۔

''میرا خیال ہے میں اس ویک اینڈ پر انجلی کے گھر شفٹ ہو رہا ہوں۔''

''یہ کون ہے؟''

''انجلی............انجلینا کوپر............میری کولیگ......''

پھر ان دونوں کے درمیان مہیب سناٹے بولتے رہے۔

اختتام ہفتہ پر کم انجلینا کے گھر شفٹ ہو گیا، اس نے سوزن کو طلاق دینے کے لئے کاغذی کاروائی کا آغاز کر دیا تھا۔ کچھ باتیں دونوں کے درمیان طے پا گئی تھیں، کچھ طے پانا باقی تھیں جب ایک دن سوزن کو جان کا خط ملا۔ یہ خط مقامی طور پر پوسٹ کیا گیا تھا، خط پر چھ دن قبل کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ کیمرون نامی ایک شخص نے اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ محاذ جنگ سے واپس آیا ہے، زخمی ہے، جان اس کے ساتھ تھا اس نے یہ خط دیا تھا جو اس نے پوسٹ کر دیا ہے۔

ماما، آجکل ہم جہاں ہیں وہاں جنگ نہیں ہو رہی ہے، تاہم جس علاقے کا ہم نے کنٹرول سنبھالا ہوا ہے وہاں حملوں کا خدشہ ضرور ہے، جس کے لئے ہم ریڈ الرٹ ہیں، یہ صحرائی علاقہ ہے، دور دور تک یا پہاڑ ہیں یا اڑتی ہوئی مٹی، گرمی شدید ہے، خطرات بہت زیادہ ہیں، میں آپ سب کو بہت یاد کرتا ہوں، کبھی کبھی ہم رات میں گھر والوں کی باتیں کرتے ہیں۔ بابا ضرور مجھے یاد کرتے ہوں گے، روز کے کیا حال ہیں، میں نے لنڈا کو ایک خط بھیجا تھا، ایک اور لکھ رہا ہوں۔ میں آپ لوگوں سے بارہ ہزار کلو میٹر دور، میدانِ جنگ میں پڑا ہوں، یہاں سے لاشیں اور زخمی جاتے رہتے ہیں، ہمارے بعض ساتھیوں نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی، کل کیمرون کو علاج کے لئے واپس بھیجا جا رہا ہے، یہ خط اسی کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں، وہ آپ کو پوسٹ کر دے گا، بس ایک بات جو میری ابھی تک سمجھ نہیں آئی وہ یہ کہ ہم یہ جنگ کیوں لڑ رہے ہیں؟ یہ کس کی جنگ ہے؟ اس کا ہماری قوم کو کیا فائدہ ہے؟ آپ دعا کریں، یہ جنگ بند ہو جائے، یہ ایک لاحاصل جنگ ہے میں واپس آنا چاہتا ہوں۔ آپ کا بیٹا جان۔

خط پڑھ کر ابھی وہ اپنے آنسو پونچھ ہی رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف کسی نے اپنے آپ کو وزارتِ دفاع کے ایک عہدیدار کے طور پر متعارف کرایا، اور پھر اسے اطلاع دی گئی کہ جان کی لاش آج رات تین بجے پہنچ رہی ہے، جسے اعزازات کے ساتھ کل دفنایا جائے گا۔ وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر دھنس گئی اور شائد ساری رات روتے روتے کسی وقت سو گئی تھی۔

جان کی آخری رسومات میں سب ہی شریک تھے، روز اور ڈیوڈ بھی آئے ہوئے تھے، کم اور انجلی بھی، لنڈا بھی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سیاہ ماتمی لباس میں موجود تھی۔ جان کو اس کے سوالات سمیت دفن کر دیا گیا، اگلے دن جب روز اور ڈیوڈ واپس نیویارک جانے کی تیاری کر رہے تھے تو روز نے اس سے پوچھا تھا ''ماما اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب جان نہیں رہا......''

''تو کیا جنگ بند ہوگئی ہے؟'' اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ روز اور ڈیوڈ کو رسمی الوداعی بوسہ دیا جس میں ذرہ برابر بھی گرمجوشی نہیں تھی، اور ان کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کمپیوٹر کے آگے بیٹھ کر اپنی سائیٹ کھولنے کے لئے لکھنے لگی۔

No War.com

۱۷/اپریل ۲۰۱۲ء

مطبوعہ ماہنامہ الحمراء، لاہور

# کتھارسس

# Catharsis

۲ر اگست ۲۰۰۵ء

میری پیاری ناجیہ!

خوش رہو، جیتی رہو، سدا سہاگن رہو، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے نہیں معلوم میرا یہ خط کس موڈ میں، کہاں اور کب پڑھوگی، بس اتنا مجھے یقین ہے کہ بالآخر یہ خط تم تک پہنچ ہی جائے گا اور تم اسے پڑھ ہی لوگی، یہ تمہارے نام میرا آخری خط ہے،۔۔۔ بلکہ یوں کہو یہ میری زندگی کی آخری تحریر ہے۔ مجھے نہیں معلوم آج شروع ہونے والا یہ خط کتنے ہفتوں یا مہینوں میں مکمل ہوگا۔۔۔ مکمل ہوگا بھی یا ادھورا رہ جائے گا۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مکمل یا ادھوری اس تحریر کے ساتھ ہی زندگی کی وہ مہلت بھی ختم ہوجائے گی جو مجھے ملی تھی۔

تم تو جانتی ہو، لکھنا اور پڑھنا میری کمزوری بلکہ مجبوری رہا ہے۔ اسی کمزوری نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا دوست بنادیا تھا۔ زندگی کے ان آخری ہفتوں یا مہینوں میں جبکہ اب مجھے سب کچھ دھندلاتا محسوس ہوتا ہے، اب جبکہ میں نے اپنے بچوں کی طرف نظر بھر کر دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔۔۔ نئے کپڑے سلوانے کا تو اب سوال ہی نہیں اٹھتا۔۔۔ موسموں کے اثرات بھی کم کم محسوس ہوتے ہیں۔۔۔ روزمرہ زندگی اس بحران سے تلپٹ ہوکر رہ گئی ہے، بس ایک خواہش جو کبھی کبھی شدید ہوجاتی ہے وہ یہی لکھنے کی خواہش ہے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، برسوں کی مستحکم عادت، ضروری تو نہیں کہ موت کے خوف سے چھٹ

جائے یا چھوڑ دی جائے، جبکہ عادت ایسی بری بھی نہ ہو، لیکن ذہن جو بالکل منتشر ہو چکا ہے اس کے لیئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ''کیا لکھوں۔۔۔؟'' یہ بالکل وہی بین الاقوامی مسئلہ برائے خواتین قسم کی کوئی چیز ہے کہ ہر صبح ہر عورت اس خلجان میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ ''آج کیا پکاؤں۔۔۔؟'' ڈھیروں ڈھیر کہانیاں دماغ میں پک رہی ہیں لیکن شائد سال بھر سے کوئی افسانہ نہیں لکھا گیا اور تمہیں تو پتا ہے یہ مرض ہم دونوں میں پایا جاتا ہے کہ جب لکھ نہیں پاتے تو خواہ مخواہ کی اداسیوں میں شرابور ہو جاتے ہیں، لہٰذا آج اس قنوطیت سے نکلنے کا ایک راستہ میں نے یہ ڈھونڈھا ہے کہ تمہیں خط لکھنا شروع کر دیا ہے۔

ایک طویل، بے ربط، مکمل یا ادھورا خط۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو شائد وقت سے پہلے ہی مر جاؤں۔

ہاں تو کہاں سے شروع کروں؟ کیا وہاں سے جب میرے ہاتھ میں موت کا پروانہ پکڑا دیا گیا تھا؟ یہ اوائل فروری کی بات ہے، وہ دن سارے دنوں جیسا ایک عام دن ہی تھا، چند دنوں سے صبح صبح میری طبیعت کسلمندسی اور گری گری رہتی تھی۔ مجھے ایسا شک پڑ رہا تھا جیسے میں نے پھر Consive کر لیا ہے۔ بھلا بتاؤ یہ کوئی تک تھی؟ بڑا بیٹا اسعد بیس برس کا ہو رہا تھا، چاروں بچوں میں سب سے چھوٹی بیٹی عریشہ بھی دس سال کی ہو رہی تھی اور اماں جان نے پھر صبح ہی صبح متلانا شروع کر دیا تھا۔۔۔ توبہ توبہ حد ہو گئی۔۔۔ مجھے تو کسی سے تذکرہ کرتے بھی شرم آ رہی تھی، تابش تک کو نہیں بتایا، عائشہ آپا سے وقت لے کر ان کو دکھانے ان کے کلینک چلی گئی۔۔۔ شائد تمہیں عائشہ آپا یاد ہوں، ڈاکٹر عائشہ جو دور پرلے سے میری کزن بھی ہوتی ہیں اور نند بھی، بہر حال رپورٹ نیگیٹو آئی اور میں نے سکون کی سانس لی، اب سوچتی ہوں کہ سکون کی وہ آخری سانسیں تھیں، عائشہ آپا نے مزید کچھ ٹسٹ کرائے اور کینسر کی تشخیص ہو گئی۔ وہ رپورٹ کیا تھی میرے لیے گویا ڈیتھ وارنٹ تھا، گو عائشہ آپا مجھے بہت تسلیاں دیتی رہیں اور بہت امیدیں بندھاتی رہیں، لیکن ناچیہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہماری زبان جھوٹ بول رہی ہوتی ہے اور ہمارے چہرے پر جڑی دو آنکھیں سچ اُگل رہی ہوتی ہیں۔ ہاں تو کینسر کی اس قسم میں

پھیلنے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لو یہ کم بخت خاصی استعمار پسند بیماری ہے، مابدولت جس کا شکار ہو چکے تھے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے نا جبیہ ہم روز ہی موت کا تماشا دیکھتے ہیں۔۔۔ اپنے پیاروں کو کفناتے اور دفناتے ہیں۔۔۔ لیکن خود کو اس عمل کا شکار ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا پندرہ سال پہلے جب تم میرے گھر آئی تھیں، پتہ نہیں کیسے ہمارے درمیان موت کا ذکر چھڑ گیا تھا۔

''بندے کو پتا نہیں ہوتا وہ کس مرض میں جائے گا'' میں نے کہا تھا۔

''مجھے پتا ہے'' تم نے کہا۔

''وہ کیسے۔''

''ہماری کلاس میں ماریشس کا ایک لڑکا ہوتا تھا جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تھے تو وہ لوگوں کے ہاتھ دیکھتا تھا، ایک ہاتھ دیکھنے کے پچاس روپے لے لیتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ تم جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو کر، وطن سے دور مرو گی۔۔۔ مجھے یہ بات جب بھی یاد آتی تو ہنسی آتی ہے، یار یہ بھی کوئی بیماری ہوئی؟ جوڑوں کا درد۔۔۔ مرنا ہی ٹھہرا تو بندہ کسی رومینٹک بیماری میں مبتلا ہو کر مرے۔۔۔ مثلاً دِل وِل کا کوئی مرض۔۔۔''

''ہاں اور اگر دل کا ڈاکٹر ہینڈسم ہو تو کسی کو مرنے میں کیا اعتراض۔۔۔'' میں نے لقمہ دیا تھا اور ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے۔

اب جبکہ مجھے دیا گیا کہ مجھے کس مرض میں مرنا ہے تو پتا نہیں میری ہنسی ٹھٹھر کیوں گئی ہے۔۔۔ بعض سچ ہمیں اچھے نہیں لگتے۔۔۔ منہ کا مزا ہی نہیں، پورا وجود کڑوا ہو جاتا ہے۔

---

۷ر اگست ۲۰۰۵ء

آج نہ جانے کیوں تم بے اختیار یاد آئیں اور پھر یاد آتی ہی چلی گئیں۔ زندگی جتنی سلجھی، سمٹی اور منظم تھی اب لگتا ہے ورق ورق بکھرنے والی ہے۔ فروری میں مرض کی تشخیص ہوئی،

اسی ماہ بڑا آپریشن ہوا، مئی سے جولائی تک کیموتھراپی کا مرحلہ چلتا رہا اور آٹھ کیمو لگیں، اب آج کل ریڈیوتھراپی کے لئے ہم سب نے لاہور میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ مرض بندے کو مارتا ہے، یا اس مرض کا علاج۔۔۔ قدم قدم پر کیسے کیسے جھٹکے لگتے ہیں، اور انسان یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کون سا جھٹکا شدید تر ہے، آپریشن۔۔۔ جس میں بریسٹ کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے،۔۔۔ یا کیمو جو ایک طرف تو انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتی ہے اور دوسری طرف سر کے سارے بال لے جاتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ ساری عزت خاک میں مل گئی ہو۔۔۔ کسی جرم، کسی قصور کے بغیر۔۔۔

آج کل میں گھر سے دور، انہی نفسیاتی جھٹکوں کی زد میں ہوں۔ میرا آپریشن بھی شوکت خانم میں ہوا تھا۔ کیموتھراپی کے لئے ہر بار تابش مجھے شوکت خانم لاتے اور لے جاتے تھے، تم تو جانتی ہو تا پیسہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، تابش نے ہر بار کیمو کے لئے لاہور جانے کو ایک تفریحی ٹور جیسا بنا لیا تھا، کیا اس خیال سے کہ میں زیادہ ٹینشن نہ لوں، ریلیکس رہوں، یا اس وجہ سے کہ آج کل ان کے اندر ایک توانا جذبہ پل رہا ہے۔۔۔ کون جانے؟؟ (یہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا نا؟ وقت آنے پر سمجھ جاؤ گی۔)

ہر بار کیمو کے لئے میں، تابش اور بچے ساتھ جاتے ہیں، لینڈ کروزر میں پانچ چھ گھنٹے کا یہ سفر عیش و آرام سے کٹ جاتا ہے، لاہور میں فائیو اسٹار ہوٹل میں سویٹ بک ہوتا ہے، وہاں ہم سب چند دن رہتے ہیں، کیمو کے بعد جب میری طبیعت سنبھلتی ہے تو واپسی کا سفر ہوتا ہے، یہ آٹھ سفر بھی گذر گئے اب ریڈیوتھراپی کے لئے ہم نے لاہور میں دو ماہ کے لئے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہر ہفتے پانچ دن شعاعیں لگتیں ہیں۔۔۔ باقی وقت ہوٹل میں۔۔۔ گو کہ بچے ساتھ ہیں، کبھی کوئی ملنے والا آجاتا ہے، کبھی ہم نکل جاتے ہیں، باقی وقت میں ہوں، میری کچھ کتابیں، جو آتے ہوئے میں ساتھ لے آئی تھی اور میرا لکھنے کا سامان۔

جب ریڈیوتھراپی ختم ہوگی تو کچھ گولیاں زندگی بھر کھانی ہوں گی، ہر تین ماہ بعد فالو اَپ ہے،۔۔۔ بس یہ ہے زندگانی کی حقیقت۔۔۔

پھر بھی میں سمجھتی ہوں ناجیہ ہم ان سے بہت بہت اچھے ہیں جن کا کوئی خدا نہیں ہے۔۔۔خدا کتنا بڑا سہارا ہوتا ہے۔۔۔یہ ڈوبنے والے سے پوچھنا چاہئے۔۔۔

بات یہ ہے ناجیہ کہ باہر کی ٹوٹ پھوٹ سب کو نظر آتی ہے، اندر کی تباہی پر کس کی نظر ہوتی ہے؟۔۔۔خود ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ اندر کے طوفانوں سے ہونے والا کٹاؤ (erosion) کب ہم کو ڈھادے گا۔

زندگی اتنی مصروف گذری کہ پتا ہی نہیں چلا ہم کب جوانی سے ادھیڑ عمری کی حد میں داخل ہوگئے، ہر ایک کی طرح یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ ایک دن مرنا ہے، لیکن وہ دن اتنی جلدی آجائے گا، اس کا خیال نہیں تھا۔۔۔فراغت کے ان دنوں میں، گزری زندگی کا ایک ایک پل یاد آرہا ہے، وہ لوگ جو ہمیں یاد بھی نہیں تھے، یاد آتے ہیں۔۔۔کہنے والے کہہ گئے ہیں کہ یادِ ماضی عذاب ہے یا رب۔۔۔میرے لیے تو یادِ ماضی ہی اب سب کچھ ہے، حال میں زندہ ہوں۔۔۔مستقبل میرے لیے لایعنی ہو چکا ہے۔ناصر کاظمی کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

---

۱۲/اگست ۲۰۰۵ء

ریڈیو تھراپی چل رہی ہے۔باقی وقت بچوں سے بات چیت میں گزر جاتا ہے، جب بچے آپس میں مصروف ہوں تو میں اپنے ساتھ لائے ہوئے اسٹاک میں سے کوئی کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دیتی ہوں، جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہوں تو لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔۔۔کچھ بے ربط سی تحریریں، اور یا پھر یہ خط، جسے شروع کیے ہوئے آج شائد دسواں دن ہے۔آج میں نے اسعد اور انعم دونوں کو سمجھایا ہے کہ یہ خط ناجیہ خالہ تک پہنچا دینا، جس طرح اور جس وقت بھی ممکن ہو، انعم تو تمہیں چھوٹی سی یاد ہوگی، اب ماشاء اللہ سترہ سال کی ہو چکی ہے، اس کے

رشتے آنے شروع ہو گئے ہیں، معلوم نہیں میں اپنی خوبصورت سی بیٹی کو دلہن بنے دیکھ سکوں گی یا نہیں، تابش بغیر کسی پروگرام کے اچانک دو دن کے لئے کراچی گئے ہوئے ہیں۔۔۔

زندگی کے سینتالیس سال کیسے گزر گئے، معلوم نہیں! بچپن سے کب لڑکپن شروع ہوا، کچھ خاص یاد نہیں۔ یہ ضرور یاد ہے کہ پڑھنے کا ہوکا تھا۔ ہمارے یہاں کئی قسم کے علمی و ادبی رسائل آیا کرتے تھے، انہی میں ایک ''ادیب'' تھا، میں نے تمہیں پہلے پہل 'ادیب' ہی میں پڑھا تھا، مجھے تمہارا افسانہ بہت پسند آیا تھا، اب مجھے یاد نہیں وہ کون سا افسانہ تھا، پھر ہر ماہ میں 'ادیب' میں سب سے پہلے تمہارا افسانہ تلاش کیا کرتی تھی۔۔۔اور پھر جون ۱۹۸۰ء کی ایک تپتی دوپہر میں نے تمہیں پہلا خط لکھا تھا، اور یوں ہماری اس دوستی کا آغاز ہوا تھا جو ربع صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔

یادیں۔۔۔اچھی ہوتی ہیں، ان کا ریموٹ کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے، یہ ہم پر مسلط نہیں ہوتیں، ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔۔۔بے اعتنائی محسوس کریں تو خاموشی سے الگ ہو جاتی ہیں۔۔۔وقت کے بہتے دریا میں ان کی وجہ سے بھنور تو بنتے ہیں، لیکن یہ بھنور جان لیوا نہیں ہوتے۔ ہاں بعض انسانی رویئے ضرور جان لیوا ہوتے ہیں۔۔۔اگر میں نے کینسر کو شکست دے بھی دی تو بعض انسانی رویئے مجھے قتل کر دیں گے۔۔۔(یہ جملہ بھی سمجھ میں نہیں آیا نا؟ سمجھ جاؤ گی)

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہاری حوصلہ افزائی پر میں نے بھی ادیب میں چھپنا شروع کر دیا تھا، کبھی کبھی ہمارے درمیان ایک مسابقت کی فضا پیدا ہو جاتی، پھر ہماری دوستی پروان چڑھتی رہی۔

گریجویشن کے بعد اور شادی سے پہلے بس یہی ہمارا مشغلہ تھا، ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھنا، ڈھیروں ڈھیر پڑھنا، کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا، اور ان ساری سرگرمیوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرنا، یار نا جیہ ہم دونوں کتنے شاندار ہوا کرتے تھے۔۔۔ہم دونوں ہی میں ذہنی مرعوبیت نام کو نہیں تھی۔۔۔کیسے کیسے سکہ بند ادیبوں کے ہم بخیے اُدھیڑا کرتے تھے، (اس وقت بھی ایک بڑی سی مسکراہٹ میرے چہرے پر سج گئی ہے)، جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر ایک دوسرے کے لیے کتابیں خریدتے تھے، میری اسکول اور کالج کے زمانے کی کئی دوستیں تھیں لیکن

جو فریکوینسی تم سے سیٹ ہوئی تھی، وہ کسی سے نہ ہوسکی۔ تمہارے سارے ہی خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، معلوم نہیں تم نے میرے خطوط کہاں رکھے ہیں، شائد کراچی والے گھر میں، گذشتہ مہینے جب میں اپنے کاغذات فائل کر رہی تھی تو تمہارے خطوط کی فائل بھی دیکھی تھی، جس میں میرے نام تمہارا آخری خط جولائی ۲۰۰۰ء کا ہے، یہ خط تم نے مجھے کینیڈا سے لکھا تھا، چونکہ تم نے وہاں جاب شروع کر دی تھی لہٰذا تم نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ شائد اب تم مجھے خط نہ لکھ سکو، بس پھر فون پر کبھی کبھار کا رابطہ رہ گیا تھا۔۔۔ اس وقت جبکہ تمہاری یادوں کے ہزار ہا چراغوں نے اُداسیوں کی گھٹا ٹوپ رات میں بھی جشن کا سماں بپا کر دیا ہے۔۔۔ تم ہزاروں میل دور ایک یخ بستہ ملک میں اپنے شوہر، بچوں اور ملازمت میں مصروف ہوگی۔۔۔

خوش رہو۔

---

۲۰ر اگست ۲۰۰۵ء

تین دن تابش رہ کر آج صبح ہی بہاولپور واپس گئے ہیں، شام میں مجھ سے کومل ملنے آگئی تھی، میں نے اپنے کسی خط میں اس کا تذکرہ کیا تھا، شائد تمہیں یاد ہو یا نہ ہو، یہ میرے اسکول کی دوست ہے۔ پچھلے ہفتے ہی اس کے شوہر کی لاہور ٹرانسفر ہوئی ہے، آج مجھ سے ملنے آئی تو ہم گذشتہ دنوں کی باتیں لے بیٹھے، کئی سال کی باتیں جمع تھیں۔۔۔ اور وہ باتونی بھی بہت ہے۔۔۔ اس کے جانے کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا ہے۔۔۔ انعم اور عائشہ اپنے بابا کے ساتھ چلی گئی ہیں، خاندان میں کوئی شادی ہے، صرف اسعد میرے ساتھ ہے، ٹی وی پر کوئی مووی دیکھتے دیکھتے سو گیا ہے۔

تمہیں یاد ہے نا ناجیہ شادی سے پہلے ہم ہر ہفتے خط لکھا کرتے تھے، شادی کے بعد مہینوں کا وقفہ پڑنے لگا تھا اور بچوں کی پیدائش کے بعد تو ''ہفتہ واری خطوط'' ''سالیانہ'' قسم کی کوئی چیز بن گئے تھے، اس سنگین صورتِ حال پر ہم ایک دوسرے سے شرمندگی کا اظہار بھی

کرتے اور ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دیتے کہ گھبرانا مت سب ٹھیک ہو جائے گا، ہماری خط و کتابت پر اس سے برا وقت اس سے قبل نہیں پڑا تھا۔ ہم دونوں ہی شادی ہو کر مشترکہ خاندانوں میں گئے تھے، پھر تمہارے یہاں تین اور میرے یہاں چار بچوں کی پیدائش۔۔۔ بس پھر یوں ہوا کہ ہم دونوں اپنے اپنے کھونٹوں سے بندھے، کولہو کے بیل کی طرح گھمیریاں لیتے رہے، شادی سے پہلے کی فراغتیں خواب و خیال ہو گئی تھیں، لیکن ایک بات تو تھی، تاہم دونوں ہی خوش تھے کم از کم اپنے جیون ساتھی سے۔ تمہیں یاد ہے نا ایک بار میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تابش کی شکل میں مجھے اپنا ہمزاد مل گیا ہے۔۔۔ حقیقی ہمسفر اور حقیقی ہمزاد۔۔۔

آج میں سوچتی ہوں ہم فیصلہ کرنے میں جلدی تو نہیں کرتے؟؟؟

---

**۲۸؍ستمبر ۲۰۰۵ء**

ریڈیو تھراپی کا سلسلہ بھی ختم ہوا، میں اپنے گھر واپس آ گئی ہوں۔ خود کو تھوڑا بہتر محسوس کر رہی ہوں، اس دوران میں نے بڑا معرکہ مارا تمہیں خط لکھنے کے بجائے دو تین افسانے لکھ ڈالے، یہ سارے افسانے مختلف رسائل میں بھجوا دیئے ہیں، سچ پوچھو تو اب اپنے لکھنے سے مطمئن ہوئی ہوں، شائد مستقبل کا کوئی ناقد میرے ان افسانوں کو میرے فن کی معراج قرار دے، فن کی تو کوئی منزل نہیں ہوتی، لیکن فنکار کی ایک منزل ضرور ہوتی ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں منزل پر آن کھڑی ہوئی ہوں۔۔۔ اس کے آگے شائد کچھ نہیں ہے۔۔۔ تمہیں تو یاد ہے نا ہمارے سارے کام ساتھ ساتھ ہی ہوتے رہے تھے، میں نے چند سال قبل تم سے کہا تھا کہ اب تمہارا افسانوں کا مجموعہ آ جانا چاہئے، لیکن اس معاملہ میں میں تم پر بازی لے گئی، میرا افسانوں کا پہلا مجموعہ جب آیا اور میں نے تمہیں بھجوایا تو تمہارا فون آیا تھا، مہینوں بعد تمہارا فون سن کر پہلے تو میں تمہاری مصروف زندگی کو کوستی رہی پھر اللہ جھوٹ نہ بلوائے ہم نے کوئی دو گھنٹے بات کی تھی۔

میری یادوں میں وہ دن محفوظ ہیں، جب ہماری ملاقاتیں ہوئی تھیں، اس ربع صدی

میں ہماری چار پانچ سے زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئی تھیں، تم کراچی میں تھیں اور میں بہاولپور میں، دونوں شہروں میں ہزار میل کا فاصلہ ہے، ایک ملک کے دوصوبوں میں اتنا فاصلہ ہوتو وہ بھی علیحدہ ہوجاتے ہیں، ہم دونوں بھی بظاہر ایک دوسرے سے الگ تھگ رہے، لیکن شائد کبھی بھی ایک دوسرے کو بھلا نہیں پائے، ہر اچھے برے موقع پر ایک دوسرے کو یاد ضرور کیا، عید، بقرعید، سالگراہوں پر تحفے تحائف کا تبادلہ ضرور کیا، تین دفعہ میں کراچی آئی تھی اور دو دفعہ تم بہاولپور آئی تھیں۔۔۔بس یہی دو یا تین دن کے لئے، توبہ توبہ۔۔۔صبح سے جو ہماری بک بک شروع ہوتی۔۔۔اسی دوران شاپنگ۔۔۔ سیرسپاٹے، ملنا جلنا سب کچھ ہوتا رہتا۔۔۔ بچوں کے حوالے سے، اپنے گھروں کے حوالے سے ہم نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔۔۔ ہمارے خوابوں کی خیر ہو۔۔۔ ہمارے خواب ایک ایک کرکے پورے ہورہے تھے۔۔۔ کہ زندگی اچانک اس موڑ پر آگئی جس کی توقع نہیں تھی، میں نے ابھی تک فون کرکے تمہیں اپنی بیماری کا نہیں بتایا ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ شائد تم سے بات نہیں کرپاؤں گی، میرے وجود کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے چیخ نہ جائے۔

ناجیہ بتا ہے، میں تم سے واقعی ایک بات کرنا چاہتی ہوں، ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔۔۔اس بات کا تعلق میری بیماری سے نہیں ہے۔۔۔مرض الموت سے بڑا بھی ایک ٹراما (Trauma) ہوتا ہے۔۔۔زندگی کو لپیٹ دینے والا جھٹکا۔۔۔

مسترد کیے جانے کا صدمہ۔۔۔

---

۱۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

آج میرا پہلا فالواپ تھا۔۔۔رپورٹ شائد اچھی نہیں ہے۔۔۔ ایک جونیئر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا ''آپ کو معلوم ہے آپ ہائی رسک پر ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا، اور میں کیا کرتی؟ یہ ڈاکٹر کتنے حقیقت پسند ہوتے ہیں۔۔۔ سفاکی کی انتہائی حدوں

تک۔۔۔آج میں نے قلم صرف اس لئے اٹھایا ہے کہ تم سے بالآخر وہ بات شیئر کروں، جو مجھے وقت سے پہلے قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔۔۔موت کی اندھی گپھاوں سے خاموش بلاوے آنے شروع ہو گئے ہیں۔۔۔ آئینہ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی۔۔۔ بہت کچھ ختم ہو چکا ہے۔۔۔

بہت کچھ ختم ہونے والا ہے۔

---

۲؍نومبر ۲۰۰۵ء

ان دنوں طبیعت زیادہ خراب رہتی ہے۔۔۔اپنے بستر اور اپنے کمرے تک محدود ہو گئی ہوں، میں نے اپنے بستر کا رخ بدل لیا ہے، جب تم میرے گھر آئی تھیں۔۔۔(اب تو اس بات کو بھی دس سال ہو رہے ہیں)۔۔۔تو میرا محل نما گھر دیکھ کر تم بہت حیران ہوئی تھیں۔ یہ میرے سسر کا آبائی گھر تھا، جسے جدید طرز پر Renovate کرایا گیا تھا۔ پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی، میری ساس نے بنگلے کا عقبی حصہ جسے میں انیکسی کہتی تھی، از سرِ نو تعمیر کرا کے ہمیں دے دیا تھا۔ چولہا تو سانجھا تھا، لیکن مجھے تین بڑے کمرے، ایک صحن اور ایک چھوٹا سا عقبی احاطہ مل گیا تھا، جسے میں نے اور تابش نے اپنے خوابوں کے مطابق سجایا، سنوارا اور بسایا تھا، دن بھر جوائنٹ فیملی کے ہنگاموں میں گزار کر، رات کے کھانے کے بعد جب ہم اپنے گوشۂ عافیت میں آتے تو واقعی یہ گوشۂ عافیت معلوم ہوتا۔

تابش نے سب کچھ میری مرضی سے کرایا تھا۔ رنگ میری مرضی سے ہوا تھا۔۔۔ پردے میری مرضی کے آئے تھے۔۔۔ایک کمرہ ہمارا تھا، ایک بچوں کا اور ایک کمرے پر ہماری گرما گرم بحث چلا کرتی تھی میں اسے *Study* بنانا چاہتی تھی اور تابش اسے اپنے ذیلی آفس کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔۔۔لیکن تمھیں تو پتا ہے نا کہ ہم عورتیں گھر کے محاذ پر کم ہی ہارا کرتے ہیں۔۔۔حقوقِ تحفظ نسواں قسم کی این جی اوز پر مجھے ہنسی آتی ہے، انسدادِ تشدد بر شوہراں قسم کی ایک این جی او بنانی چاہئے۔۔۔تم یہاں ہوتیں تو میرے معرکۃ آلارا خیالات سے اتفاق

کرتیں۔۔۔ یار ناجیہ ہم دونوں ہی بڑے تخلیقی ذہنوں کے ہیں، بس ہماری قدر نہ ہوئی (میں ہونٹ چیر کر اس وقت بھی مسکرانے کی کوشش کر رہی ہوں) خیر ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں نے اپنے بستر کا رخ بدلوالیا ہے، تابش نے صحن میں گلاب کے تختے لگائے ہیں۔۔۔ بس یہی ایک معاملہ تھا جہاں مجھے تابش کی ماننی پڑی میں یہاں موتیا اور رات کی رانی لگانا چاہتی تھی مگر تابش نے ایسے ایسے زراعتی مسائل بیان کیئے جو عقلِ شریف سے پرے گزر گئے۔۔۔ تم نے تو دیکھے تھے سرخ، پیلے، جامنی اور سفید گلاب۔۔۔ تم نے چند گلاب توڑے بھی تو تھے۔۔۔ تمہاری آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی تھی۔۔۔ بچکانہ خوشی۔۔۔ تم نے اعتراف کیا تھا نا کہ تم نے اپنی زندگی میں اتنے بڑے سائز کے گلاب نہیں دیکھے۔۔۔

سارا دن میرے پاس کوئی کام نہیں ہوتا پھر بھی گھر کے سارے کام ہو جاتے ہیں۔۔۔ زمینوں پر سے عورتیں آجاتی ہیں، میری دونوں دیورانیاں ساری گرہستی دیکھ لیتی ہیں۔۔۔ تابش کی دفتری مصروفیات۔۔۔ بچوں کی پڑھائیاں۔۔۔ سب چل رہی ہیں۔ تمہیں تو شائد یاد نہ ہو بڑی بیٹی انعم گریجویشن کر رہی ہے۔۔۔ میرے پاس ملنے والیوں کی کمی نہیں۔۔۔ لیکن ان کی وجہ سے مجھے ڈپریشن زیادہ ہوتا ہے۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں۔۔۔ اب میں زیادہ وقت (عبادت کے علاوہ) اچھی اچھی کتابیں پڑھنے اور کچھ نہ کچھ لکھنے میں گزار رہی ہوں۔۔۔ اب بھی میرے افسانے 'ادیب' میں چھپ رہے ہیں۔

تابش کے پاس بھی وقت کم ہوتا ہے، ان کی کاروباری مصروفیات پھیلتی جا رہی ہیں۔۔۔ جب میری شادی ہوئی تھی تو ان کی ایک فیکٹری تھی، جس میں تینوں بھائیوں کا حصہ تھا، اب صرف تابش کے پاس تین فیکٹریاں ہیں۔۔۔ ہر ہفتے دس دن بعد وہ کسی دوسرے شہر کے دورے پر ہوتے ہیں۔۔۔ مجھے حیرت تھی ان کے بزنس کا کوئی معاملہ کراچی میں نہیں تھا۔۔۔ لیکن ان کا مہینے میں ایک چکر کراچی کا لگنے لگا تھا۔۔۔

پیاری ناجیہ، رونے کے لئے ایک شانے کا سہارا شائد مضبوط سے مضبوط عورت کو بھی چاہئے۔۔۔ میں کس سے لگ کے روؤں؟۔۔۔ میرے اردگرد اتنی بھیڑ ہے کہ کھوے سے

کھوا چھلتا ہے۔۔۔ پھر کیوں میں تنہائی کے احساس سے شرابور رہتی ہوں۔۔۔

شک نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ میں نے تابش پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔۔۔ لیکن یہ بات تو کھل گئی ہے۔۔۔ وہ کراچی میں رہتی ہے۔۔۔ مطلقہ ہے، اس کی دس سال کی ایک بیٹی ہے اور اسکا نام شافعہ ہے۔۔۔

۞۞۞

۲۰۱۲ء

مطبوعہ ماہنامہ الحمراء، لاہور

# جھٹکا

اس کے کسی سوال پر وہ بے تکان بولنے لگا تھا

"پچیس سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے لیکن میں تم سے ایک دن بھی غافل نہیں رہا۔ میرے سکون کے لیے یہ بات کافی تھی کہ تم اپنے گھر میں خوش اور مطمئن ہو۔ ان پچیس سالوں میں خود میں کسی ایک جگہ نہیں ٹکا، میرے دانہ پانی نے مجھے کئی ملکوں کی خاک چھنوائی، یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس دربدری میں وہ ملک شامل نہیں تھا جہاں تم اور تمہارا خاندان مقیم تھے مگر میں نے ہمیشہ تمہارا دھیان رکھا۔ جب تمہاری عثمان سے شادی ہوئی۔ پھر جب تمہاری پہلوٹھی کی بیٹی زارا ہوئی۔ پھر تم لوگ متحدہ عرب امارات چلے گئے۔ وہیں عائشہ ہوئی، تمہارے گھر کی ہر چھوٹی بڑی خبر سے میں نے خود کو آگاہ رکھا، کیوں؟ اس کا تو مجھے نہیں پتا، پھر جب عثمان کی گاڑی کا حادثہ ہوا، اس وقت میں واقعتاً تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن ان دنوں میں ملائیشیا میں تھا۔ پھر عثمان کی ملازمت ختم ہوئی اور پھر تم سب واپس کراچی آ گئے۔ یہیں پہلے زارا کی شادی ہوئی، دوسرے ہی سال عائشہ بھی رخصت ہو کر کینیڈا چلی گئی، اور گذشتہ سال تم نے بیوگی کی چادر اوڑھ لی۔"

حسن بولتے بولتے چپ ہوا۔ تو ماہ رخ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ شام میں جب حسن کا فون آیا تو اس نے ایک دو جملوں کے تبادلے میں ہی حسن کو پہچان لیا تھا۔ یہ بات بجائے خود حیرت انگیز تھی کیونکہ یونی ورسٹی کی تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ پھر حسن سے کبھی نہیں مل سکی تھی گو کہ یونی ورسٹی کے چار سالوں کے دوران دونوں کی بہت اچھی دوستی تھی لیکن آخری سال کے امتحانات ختم ہوتے ہی حسن اپنے والد کے پاس مسقط چلا گیا تھا،

اور چند ماہ بعد ماہ رخ کی شادی اپنے کزن عثمان سے ہوگئی تھی۔

عثمان بہت اچھا شوہر تھا البتہ ایک واقعہ نے اسے بہت محتاط کردیا تھا شادی کے چند دن بعد اس نے یونی ورسٹی کی الوداعی تقریب کی چند تصاویر جن میں کئی لڑکوں لڑکیوں کے ساتھ اور بعض جگہ اساتذہ کے ساتھ اس کی تصاویر تھیں، عثمان کو دکھائیں، انہیں دیکھ کر عثمان نے کہا کچھ نہیں تھا مگر ماہ رخ یہ سمجھ گئی تھی کہ اسے یہ تصاویر بالکل پسند نہیں آئی ہیں، اس نے اگلے دن یہ تصاویر لفافے میں بند کرکے اپنے کاغذات میں کیموفلاج کرکے چھوٹے سوٹ کیس میں منتقل کردیا تھا، ان کئی تصاویر میں حسن بھی تھا۔

تاہم کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی سہیلی سے زندگی کے کسی موڑ پر ملاقات ہوجاتی پھر وہ گھنٹوں اپنے گزرے دنوں کو یاد کیا کرتیں، کئی دفعہ حسن کا ذکر بھی آتا، اس کے بارے میں اسے کچھ نہ کچھ خبر ملتی رہتی، لیکن جس طرح حسن کو اس کی زندگی کا ہر اہم پہلو یاد تھا، اسے نہیں تھا۔

''میں گذشتہ کئی ماہ سے تمہارے شہر میں ہوں، لیکن مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم زارا کے پاس جدہ گئی ہوئی ہو، میں شدت سے دو ماہ قبل تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن تم نے واپسی میں بڑی دیر کردی۔''

ماہ رخ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ آخر کس بات کی دیر؟

''میں تمہاری بات سمجھی نہیں، آپ مجھ سے اب بھی ملنے آسکتے ہیں۔''

''اب ۔۔۔'' دوسری طرف بڑی گہری خاموشی چھاگئی۔

''عائشہ بیمار ہے، میں شائد جلد ہی اُس کے پاس کینیڈا چلی جاؤں۔'' ماہ رخ نے کہا۔

''اچھا ۔۔۔'' وہ ہارا ہوا جواری لگ رہا تھا۔

''بھئی ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم کئی ماہ سے میرا انتظار کررہے ہو، اور اب جب میں خود تمہیں بلا رہی ہوں تو تم نخرے کررہے ہو۔'' ماہ رخ ہنسی مگر دوسری طرف سے کوئی جوابی ہنسی سنائی نہیں دی، ایک گہری سانس کی آواز البتہ آئی۔

''اگر کل تمہاری کوئی مصروفیت نہیں ہے تو میں گیارہ بجے تک پہنچوں گا۔'' حسن نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

دن کا باقی ماندہ حصہ اور ساری رات اس کی ذہن کی سکرین پر یونی ورسٹی کے بتائے ہوئے چار سال جھلکیاں مارتے رہے۔ حسن بہت وجیہہ اور ہینڈسم تھا، لمبا قد، چھریرا بدن، کھلتا ہوا سانولا رنگ، غلافی آنکھیں، نرم مسکراہٹ، ہمدردانہ رویہ، دوستوں کا دوست، اسے خواتین کے ملبوسات میں ساری بہت پسند تھی، اسے یاد تھا کہ رنگوں میں اسے سبز رنگ کا تقریباً ہر شیڈ پسند تھا۔۔۔موتیا کے پھولوں سے اسے اتنا عشق تھا کہ شعبہ میں کلاس روم کے باہر کیاری میں اس نے مالی سے کہہ کہہ کر موتیا کے پودے لگوائے تھے۔۔۔

وہ ذہن پر زور دے کر سوچتی رہی کہ حسن کو کھانے میں کیا پسند تھا؟

کبھی وہ سب اکٹھے کینٹین جاتے کھانے پینے کی چیزوں کا خوب ذکر ہوتا، اسے یاد آیا حسن کو کوفتے، شامی کباب، مٹر پلاؤ اور کڑھی چاول بہت پسند تھے۔

حالانکہ وہ تھکی ہوئی تھی لیکن رات گئے تک کچن میں مصروف رہی۔ پھر اسٹور میں کھٹر پھٹر کرتی رہی، سونے سے قبل وہ تصاویر نکال چکی تھی، جو یونی ورسٹی کی الوداعی تقریب کی تھیں اور جنہیں اس نے اپنی کتابوں اور کاغذات میں کیموفلاج کر کے چھوٹے سوٹ کیس میں منتقل کر دیا تھا۔

گیارہ بجنے والے تھے جب اطلاعی گھنٹی بجی

''نسرین دیکھنا کون ہے'' اس نے ملازمہ کو آواز دی اور جلدی سے شیشے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا، وہ خود اپنی تیاری پر حیران تھی، سبز ساری، ہلکا سا میک اپ، بالوں میں موتیا کے پھولوں کی لڑیاں۔

موتیا کے پھولوں سے بھر کر ایک آرائشی برتن پہلے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں رکھوا دیا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے کے صوفے پر حسن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا، نیلی شرٹ، سیاہ پتلون، کنپٹی اور پیشانی کے کچھ بال سفید، کچھ بدستور کالے، اس کے ساتھ ایک بائیس تیس سالہ نوجوان تھا، جو شکل وصورت سے حسن کا بیٹا لگ رہا تھا۔

کمرے میں ماہ رخ کے آنے پر وہ دونوں تعظیماً قدرے اٹھے اور پھر بیٹھ گئے۔

"ماہ رخ یہ میرا بیٹا سلیم ہے۔"

اس نے سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی۔

حسن بہت خاموش تھا۔ وہ جو محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا، بولنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔

"ابو بتا رہے تھے کہ آپ ان کی کلاس فیلو تھیں۔ سچ سچ بتائیں آنٹی ابو کیسے اسٹوڈنٹ تھے۔"

سلیم اس سے پوچھ رہا تھا

وہ ہنس پڑی "بہت بریلینٹ تو نہیں تھے لیکن ماسٹرز میں ان کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی اساتذہ ان سے خوش رہتے تھے۔"

سلیم جو یونی ورسٹی کا طالب عالم تھا، یونی ورسٹی کی باتوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔

"ٹھہرو میں تمہیں اپنی الوداعی تقریب کی تصاویر دکھاوں۔"

وہ پچیس سال پرانی تصاویر اٹھا لائی۔ سلیم ذوق وشوق سے تصاویر دیکھتا رہا، سوالات پوچھتا رہا، کہیں حیرت کا اظہار کرتا، کہیں مسکراتا اور کہیں قہقہہ لگاتا۔

"ابو پہلے تو آپ بالکل بھی اسمارٹ نہیں تھے، ابو کی ڈریسنگ تو دیکھیں" وہ پوری طرح اپنے باپ کو چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔

"چلو 'پہلے نہیں تھا' کا مطلب ہے کہ اب تو ہوں۔" حسن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"اب تو میرے ابو ہیرو ہیں ہیرو۔۔۔ اتنا گریس فل بندہ نہ ہالی وڈ میں ملے گا نہ بالی وڈ میں۔۔۔"

"اور نہ لالی وڈ میں۔۔۔" ماہ رخ نے لقمہ دیا اور دونوں ہنسنے لگے۔

ان قہقہوں میں حسن شامل نہیں تھا۔

اس نے نہ تصاویر دیکھیں اور نہ ان میں دلچسپی کا اظہار کیا، وہ خاموش بیٹھا تھا، آنکھوں پر لگے سیاہ عینک کی وجہ سے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آیا وہ واقعی سامنے کی دیوار پر لگی پورٹریٹ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ یا اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

ماہ رخ کو لگا کہ اس وقت اس کی دلچسپی کا محور شائد صرف وہ ہے، گو کہ اس نے ابھی تک اس کی

سبز ساری اور موتیا کے پھولوں کی تعریف نہیں کی تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، بیٹے کی موجودگی میں ویسے بھی وہ اس کی تعریف نہیں کر سکتا تھا۔

نسرین مشروبات لے کر آئی۔ اور تینوں گلاس میز پر رکھ دیئے۔

''لیجئے حسن۔۔۔آپ کی پسندیدہ سکنجبین۔۔۔'' ماہ رخ نے حسن کو مخاطب کیا حسن نے ٹٹولنے والے انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔ جو گلاس سے لگنے کے بجائے، آرائشی برتن سے ٹکرایا۔ سلیم نے گلاس پکڑانے میں مدد کی، ماہ رخ کو ہزاروں ووٹ کا جھٹکا لگا۔

''اصل میں شوگر کی وجہ سے بابا کی نظر۔۔۔'' سلیم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، ''دو ماہ پہلے تک تو کچھ نہ کچھ نظر آجاتا تھا، مگر اب۔۔۔''

✿✿✿

۲۷ر جون ۲۰۱۳ء

(غیر مطبوعہ)

# خالی گھر

## (Abandon House)

میں اپنے ناول کے ایک باب کے لیے اپنے دوستوں مارک اور جان کے ساتھ سارا دن گھوسٹ ٹاون میں گزار کر واپس جا رہا تھا۔ مارک گاڑی چلا رہا تھا، اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اونچی آواز میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھا جان، کبھی کبھی کوئی لقمہ دیتا اور ساتھ ہی اپنی ران پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتا۔ کبھی کبھی وہ یہ ہاتھ میرے کندھے پر بھی رسید کرتا۔ مارک کے ساتھ بہر حال وہ یہ سلوک نہیں کر سکتا تھا۔

میری اور جان کی ان اوٹ پٹانگ حرکتوں کی واحد وجہ یہ تھی کہ آنے والی نیند کو بھگایا جاسکے، اور مارک کو جاگتا رکھا جائے، کم از کم اس وقت تک کہ ہائی وے پر کوئی ہوٹل نظر نہ آجائے جہاں ہم پی پلا کر رات گزار سکیں کہ تھکن اب ہڈیوں میں اترنے لگی تھی۔

جلد ہی قصبے کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا۔ پہلے ہم نے پیٹرول پمپ پر رک کر پیٹرول ڈلوایا اور پھر ٹاون کا ایک چکر لگایا اور ایک ہوٹل پر گاڑی روک دی۔ کھانے کے بعد پیگ چڑھا کر کچھ دیر ہم بکواس کرتے رہے اور پھر پتا نہیں کون کب سو گیا۔

تمازت کے احساس سے میری آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، سورج نکلا ہوا تھا اور اس کی چمکیلی روشنی کمرے کو منور کر رہی تھی۔ آج سورج بارہ دن بعد بالآخر بادلوں کو چکمہ دے کر نکل ہی آیا۔ مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی، میں نے بستر پر

پڑے پڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ مارک میرے ساتھ بستر پر تھا جبکہ جان صوفے پر پڑا تھا، اور یہ ایسے ہی ہونا تھا۔

جان بستر پر اور مارک صوفے پر سو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ مارک گوشت کا ایسا پہاڑ تھا جو کسی بھی وقت صوفے سے ٹیک کر کم شدت والے زلزلے کا باعث بن سکتا تھا۔

جان ایسا بے خبر سو رہا تھا جیسے کسی نے مار کر ڈال دیا ہو، اور اگر کوئی مارک کے بھیانک خراٹے سن سکتا تو جان کی ''موت'' کی وجہ بھی سمجھ لیتا۔

میں نے اس ساری صورتِ حال پر دل ہی دل میں قہقہہ لگایا اور بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ میں ان کاہلوں کے انتظار میں چمکیلے دن کی خوشی کو کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکل گیا، اس سے قبل کہ سورج دوبارا بادلوں میں چھپ جائے، میں اس کی ایک ایک شعاع کو اپنے بدن میں جذب کر لینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر میں ٹاؤن کی گلیوں میں گھومتا رہا، آج اتوار تھا لہٰذا رش کم تھا، میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا گھسا تاکہ ناشتہ کر سکوں۔

''کیا یہاں کوئی تاریخی جگہ ہے۔۔۔ یا کوئی قابلِ دید مقام؟'' میں نے استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔

وہ ایک لمحہ کو سوچ میں پڑ گیا

''یہ ایک چھوٹا سا رہائشی قصبہ ہے جناب۔۔۔ یہاں ایسا کوئی تاریخی مقام تو نہیں البتہ قصبے کے واحد چرچ کی عمارت سو سال پرانی ہے۔ اسے دیکھ کر آپ سو سال قدیم طرزِ تعمیر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔۔۔ اور ہاں چرچ کے عقب میں ایک پارک بھی ہے جہاں آپ سورج کی شعاعوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔''

ناشتہ کے بعد میں استقبالیہ کلرک کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا اور دس منٹ بعد میں نے خود کو چرچ کے سامنے پایا۔

چرچ کی عمارت چھوٹی اور قدیم تھی، اُسے بوڑھے درختوں نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

پتھروں پر کہیں کہیں کائی جمی ہوئی تھی۔ صدر دروازے کے داہنی جانب بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سب کچھ بڑا رومانوی اور پرسکون تھا۔ میں نے اپنے کیمرے سے اُس قدیم اور خوبصورت چرچ کی چند تصاویر لیں۔

اسی دوران چرچ کا صدر دروازہ کھلا اور چند لوگ باہر نکلے، دعائیہ تقریب کے بعد شاید لوگ اب گھر واپس جارہے ہوں، انہی میں وہ بھی تھا جو اُن سب سے الگ تھا۔

اس نے پادریوں والا لباس پہنا ہوا تھا۔ گلے میں صلیب لٹک رہی تھی۔ میں نے مردانہ وجاہت کا ایسا نمونہ اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ ایسے جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے کوئی یونانی مجسمہ تراشا ہو۔ میں نے اتنی خوبصورت چھوٹی پیوست داڑھی بھی نہیں دیکھی تھی، وہ ایک شاندار پادری تھا۔

لوگ جاچکے تھے البتہ وہ پادری کسی نوجوان دوشیزہ سے گفتگو کررہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر اندر چلا گیا، مجھے ایسا لگا جیسے ٹائم ٹنل میں بیٹھ کر سو برس پرانے زمانے میں پہونچ گیا ہوں۔ جب میں واپس آیا تو وہ پادری اسی دوشیزہ سے گفتگو کر رہا تھا، اب اس لڑکی کا چہرہ میں دیکھ سکتا تھا، وہ پلک جھپکائے بغیر پادری کو دیکھ رہی تھی، مسحور زدہ ۔۔۔ اُسے اپنے اردگرد کا بھی ہوش نہیں تھا۔

میں جب ان کے قریب سے گذرا تو پادری نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا، اُس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میتھیو۔۔۔"

میں مسکرا کر اُن دونوں کو چھوڑ کر چرچ کی عقبی سمت بنے پارک میں چلا گیا۔ اگر دھوپ نہ نکلی تو میں کبھی بھی پارک میں کچھ دیر بیٹھنے پر خود کو آمادہ نہ کرسکتا، لیکن ابھی تو جی چاہ رہا تھا کہ ساری دھوپ اپنے جسم میں اتار لوں۔

میں پارک میں جس بینچ پر بیٹھا تھا وہ سڑک کے قریب تھی، پتلی سڑک کے دوسری طرف چند مکانات بنے ہوئے تھے۔ حسب عادت میں ایک ایک چیز کا بڑا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

پتلی سڑک کے دوسری طرف جو چند مکانات بنے ہوئے تھے ان میں پہلا مکان کچھ مختلف تھا۔ اور جلد ہی بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ *Abandon House* تھا۔ خالی گھر!

اس کے چھوٹے سے صدر دروازے کے کنارے بنی کیاری سوکھی ہوئی تھی۔ در و دیوار کا اکھڑا ہوا

رنگ وروغن بتا رہا تھا کہ یہ مکان کئی برسوں سے بند پڑا ہے۔
"ابنڈن ہاؤس ہے!" میرے قریب بیٹھتے ہوئے اس بوڑھے نے کہا۔
حالانکہ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ شاید مجھے محویت سے اس گھر کو دیکھتا پا کر اُس نے از خود معلومات فراہم کرنا ضروری سمجھا ہو۔ "میں باغ کی دیکھ بھال کرتا ہوں اور یہیں رہتا ہوں" اس نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا۔
"یہ خالی گھر کس کا ہے؟"
"پیٹر کا۔۔۔ وہ متوسط درجے کا ایک کامیاب تاجر تھا۔۔۔ پہلے وہ اپنی بیوی مارتھا کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔۔۔ پھر دونوں کی طلاق ہو گئی۔۔۔ مارتھا اپنا آٹھ سالہ بچہ لے کر یہاں سے کسی دوسرے شہر چلی گئی۔۔۔ طلاق کی وجہ سارا تھی۔۔۔ پیٹر نے سارا سے شادی کی تو وہ دونوں اسی گھر میں رہتے رہے۔۔۔ سارا ایک گھریلو لڑکی تھی۔۔۔ مگر شادی کے دوسرے ہی سال پیٹر کی گاڑی کا شدید حادثہ ہوا، جس میں وہ جانبر نہ ہو سکا۔۔۔"
بوڑھا خاموش ہو گیا، میں بھی ایسا اداس ہو گیا جیسے پیٹر میرا کوئی قریبی عزیز یا دوست رہا ہو۔
پتلی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گذر رہی تھیں، جن کی وجہ سے کچھ دیر کو پارک کا سکون متاثر ہو جاتا۔
"پیٹر کی آخری رسومات اور تدفین کے بعد سارا میں ایک بڑی تبدیلی دیکھی گئی وہ پابندی سے چرچ جانے لگی تھی۔ شوہر کی حادثاتی موت کے ڈیڑھ سال بعد سارا کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ بچی کا باپ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس دکھ میں سارا نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی، ایک دن اسی نشے کے عالم میں اُس نے اپنی چند ماہ کی بچی کو باتھ ٹب میں ڈبو کر مار دیا۔۔۔ پھر وہ گرفتار ہو گئی اور اُسے آٹھ سال قید کی سزا ہو گئی۔"
"یہ قتل اُس نے کب کیا تھا؟" میں پوری طرح بوڑھے کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔
"آٹھ سال قبل۔۔۔"
"اوہ۔۔۔ تو گویا سارا اب رہا ہونے والی ہے۔"
"نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔ وہ قید کے چوتھے سال جیل میں ہی مر گئی تھی۔۔۔"

''اوہ۔۔۔بڑے افسوس کی بات ہے۔'' مجھے لگا جیسے میری کوئی قریبی عزیزہ کا انتقال ہو گیا ہو۔
کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے، پھر بوڑھا اٹھ گیا
''جب تمہیں یہ سارے واقعات معلوم ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ سارا کے بچے کا باپ کون تھا۔۔۔میرا مطلب ہے سارا کسے اپنے بچے کا باپ بتلاتی تھی۔۔۔''
بوڑھا چند لمحے خاموش رہا
''میتھیو۔۔۔شائد نہیں۔۔۔یقیناً میتھیو۔۔۔''
وہ بڑبڑایا اور باغ کے اونچے، گھنے درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

☼☼☼

اپریل ۲۰۱۴ء
(غیر مطبوعہ)

# تضاد

اسے دیوانے موسم اور پاگل ہواؤں کا اندازہ اس وقت ہوا جب نصف شب کے قریب وہ دبے پاؤں لاونج سے اوپر کی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لاونج کی ایک دیوار شیشے کی تھی، اُس سے باہر تند ہواؤں سے ناچتے، جھومتے درخت، بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح لگ رہے تھے، بارش تھم چکی تھی لیکن طوفانی آثار ابھی تک باقی تھے، بہترین لیدر جیکٹ کے باوجود برفیلی سردی مزاج پوچھ رہی تھی، اپنے شاندار بنگلے کے قدرے اندرونی حصہ میں اپنے بیڈ روم میں نہ اُسے موسم کی تندی کا اندازہ ہوسکا تھا نہ سردی کا، اور نہ ہی کبھی چنگھاڑتی، کبھی سسکارتی ہواؤں کا۔

اس کی بیوی تانیا، گولیاں کھا کے سوچکی تھی اور اب گہری نیند میں تھی، وہ بڑے احتیاط سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، شاید اوپری منزل پر رہنے والے بیٹے اور بہو کا خیال رہا ہو۔ سیڑھیاں ایک خوبصورت، سجے سجائے لاونج میں ختم ہوئیں، یہاں بھی لاونج کی ایک دیوار شیشے کی تھی، ایسا شیشہ، کہ اندر سے باہر ہر چیز دیکھی جا سکے لیکن باہر سے اندر کچھ نظر نہ آئے۔ ایک لمحہ کو وہ شیشے کی اس دیوار کے آگے کھڑا ہوا، یہاں ہواؤں کی تندی کا زیادہ احساس ہو رہا تھا، درزوں سے داخل ہونے والی تیز ہواؤں کی ژوں۔۔۔ژوں۔۔۔موسم کی دیوانگی کی خبر دے رہی تھی۔

وہ دبے قدموں لاونج کے داہنی جانب بنے اُس جہازی سائز کمرے کے بند دروازے کے آگے چند لمحے کھڑا رہا، جو اس کے بیٹے اور بہو کے استعمال میں تھا، جیسے کوئی سن گن لے رہا ہو، اندر تاریکی بھی تھی اور گہری خاموشی بھی۔

''سو گئے ہیں'' اُس نے گویا خود کو تسلی دی اور راہداری کے آخری کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کمرہ شاذ و نادر ہی کھلتا تھا۔ اُس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے چابی نکالی، دروازے میں گھمائی اور دروازہ کھل گیا، اندر داخل ہوتے ہوئے اُس نے پھر احتیاطاً بیٹے کی خوابگاہ کی طرف دیکھا، ہر طرف سناٹا تھا۔ اُس نے اندر داخل ہو کر لائٹ جلا دی۔ اور بغیر شور کیے آہستگی سے پہلے دروازہ بند کیا پھر اندر سے چابی گھما کر لاک کر دیا۔

یہ قدرے چھوٹا کمرہ تھا، داہنے جانب والی دیوار کے ساتھ ایک قد آدم شیشم کی لکڑی کی شاندار الماری تھی اس کے بعد شیشم کی لکڑی ہی کی ایک میز، اس کے آگے ایک گردشی کرسی، میز پر ایک طرف کچھ انگریزی ناولوں کا ڈھیر سا پڑا ہوا تھا، اور دوسری طرف چند فائلیں اوپر تلے دھری تھیں۔ بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ ایک تین نشستوں والا صوفہ رکھا تھا، اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کچھ بند سوٹ کیس، لکڑی کا ایک مضبوط ٹرنک، اور چند مضبوط کارٹن پڑے تھے، ہوسکتا ہے ان میں کپڑے ہوں یا گھر کی فالتو چیزیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جس چیز کا گھر میں استعمال نہیں تھا، اُن فالتو اضافی چیزوں کو یہاں رکھ دیا گیا ہو۔

کمال پڑے ہوئے صوفے پر کچھ دیر کے لیے ڈھیر ہو گیا، اس کا چہرہ سپاٹ تھا، پتا نہیں کیوں اوپر آیا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے گہری سانسیں لینے کے بعد وہ اٹھا، شیشم کی قد آدم خوبصورت الماری کا تالا کھولا۔ اندرونی دراز کی چابی تلاش کر کے وہ دراز کھولی، کوئی چھوٹی سی چیز تھی، جسے اُس نے احتیاط سے نکالا، میز پر رکھا، پہلے دراز بند کی پھر الماری بند کی۔ وہ چھوٹی سی ملفوف ڈبیا اٹھائی اور کمرے سے باہر آنے لگا۔ اچانک اُس کی نظر میز پر پڑے انگریزی ناولوں کے ڈھیر پر پڑی۔ اُس نے ایک دو کتابوں کو دائیں بائیں کیا تو ایک کتابی سائز کا قرآن کا نسخہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

اُس نے قرآن اٹھایا، الٹ پلٹ کر دیکھا اور ابتدائی صفحات کھولے، دوسرے صفحہ پر لکھا ہوا تھا'' پیارے بیٹے کمال ضیاء کے لیے۔ اس اُمید پر کہ اس کی زندگی اس آسمانی کتاب کی روشنی میں گزرے گی۔'' نیچے جو دستخط تھے، وہ اس کے مرحوم والد کے تھے، جو تاریخ لکھی ہوئی

تھی وہ آج سے پینتیس سال پہلے کی تھی۔
ایک پھیکی سی مسکراہٹ کمال کے چہرے پر کھنچ گئی، اُسے پینتیس سال اُدھر کا وہ دن یاد آ گیا جب اس کے والدین حج کر کے آئے تھے، اس کے والد نے بہت سارے تحائف کے ساتھ یہ قرآن کا نسخہ بھی اُسے دیا تھا۔ اُس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔
اُس نے قرآن ناولوں کے ڈھیر کے بجائے فائلوں کے اوپر واپس رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ دروازے میں چابی گھماتے ہوئے اس نے پھر احتیاطاً بیٹے کی خوابگاہ کی طرف دیکھا، سناٹا تھا!
وہ دبے قدموں نیچے آ کر اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ تانیا گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔
یہاں بھی ہر طرف گزرتی رات کا سناٹا تھا۔
ہواؤں کا پاگل پن بھی تھمنے لگا تھا۔
صبح تیار ہو کر اس نے اپنے آپ کو قد آدم آئینے میں دیکھا، کچھ کمزور لگ رہا تھا، اُس نے مسکرانے کی کوشش کی تو خود کو اچھا لگنے لگا۔ ویسے وہ اچھا ہی تھا، کئی آفیسرز کی بیویاں اُس کا قرب تلاشتی اور دوستیاں گانٹھتی تھیں، سانولا رنگ، لمبا قد، اسمارٹ جسم، کالے بالوں پر غالب آتے سفید بال، پینسٹھ سال کی عمر میں بھی چاق و چوبند اور محفلوں کی جان! بیٹی کے بچوں کا نانا، بیٹے کے بچے کا دادا، دوستوں کا دوست، دشمنوں کا دشمن!
''گڈ'' گویا اس نے خود کو شاباشی دی اور ڈائننگ روم کی طرف چلا گیا، ملازمہ نے ناشتہ لگا دیا تھا، لاونج میں لگی ہوئی گھڑی آٹھ بجا رہی تھی، اُس کی بیوی تانیا بھی اُس کے پیچھے ہی کھانے والے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ تاہم وہ کچھ بولی نہیں۔ دونوں نے ناشتہ شروع کیا، کمال اپنی کسی بات سے پریشانی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا، لہٰذا اُس نے نارمل لہجے میں کہنا شروع کیا،
''گیارہ بجے تک ارسلان کو اُٹھا دینا، اُسے کرنل سلام سے ملنا ہے۔''
تانیا خاموش رہی تو کمال نے پھر کہا،
''میں ایک گھنٹے تک آ جاؤں گا، تیار رہنا، کل بھائی جان کا فون آیا تھا، امی کی

طبیعت خراب ہے، اُنہیں دیکھنے چلیں گے۔"

تانیا کو اپنی ساس کے تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اُسے کمال کی واپسی تک کوئی بہانہ سوچ لینا ہوگا، تاکہ اس بے رس وزٹ سے بچ سکے۔

ناشتہ کرکے وہ تانیا کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ڈرائیور نے لپک کر اُس کی چمچماتی لینڈ کروزر کا دروازہ کھولا، ڈرائیور نے گاڑی باہر نکالی، گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور بھاری مین گیٹ بند کرنے لگا۔

کمال نے ایک نظر اپنے بنگلے پر ڈالی۔ یہ شہر کا پُرتعیش علاقہ تھا، امیر کبیر لوگوں کی جائیدادیں یہیں تھیں۔ ملک کے وزیرِ اعظم اور دیگر وزراء، کئی فوجی افسروں کے شاندار بنگلے یہیں تھے۔ اس علاقے میں گھر بنانا اُس کا خواب تھا۔ یہ خواب چار سال قبل پورا ہوگیا تھا۔

یہ بنگلہ جو اس پورے سیکٹر کا سب سے شاندار بنگلہ تھا، چار سال قبل جب بن کر تیار ہوا، تو اس کا کون سا رشتہ دار اور کون سا دوست ایسا تھا جو اس کا گھر دیکھنے نہیں آیا تھا وہ بڑی خوشی سے انہیں اپنا گھر گھماتا، کبھی کبھی یہ ذمہ داری اُس کی بیوی بھی نبھاتی، ایک احساسِ فخر سے وہ اُنہیں گھر کے مختلف حصّے گھماتی اور مہمان کے چہرے پر بھی نظر ڈالتی جاتی، جن میں سے بعض کے چہروں پر بڑا سا "کاش۔۔۔" لکھا ہوا اُسے نظر آتا تو وہ ایک احساسِ طمانیت اور فخر سے کہتی "اللہ کا کرم ہے۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ان کی نیوی سے ریٹائرمنٹ کے بعد کیسے گذارا ہوگا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں بھی اپنا گھر دے دیا۔"

---

جب یہ بنگلہ بن کے تیار ہوا تھا تو اُس نے اپنے دوستوں اور سسرال والوں کی شاندار دعوت کی تھی۔ ماں سمیت اپنے رشتہ داروں کو اُس نے اس لیے نہیں بلایا تھا کہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں وہ الگ الگ سے لگتے۔

جب اُس کی بہنوں، خالاؤں اور ماموں کو پتا چلا اور اُنہوں نے جلی کٹی سنانا شروع کیں تو تانیا نے، قرآن خوانی کا بندوبست کرکے اُن سب کو بھی ایک دن گھر پر مدعو کرلیا۔

کوئی مسئلہ تھوڑی تھا۔

محل نما اس گھر میں نہ جگہ کی تنگی تھی، نہ ملازمین کی کمی تھی، لہٰذا اتنے ڈھیر سارے لوگوں کا آنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تانیا اس دن ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سسرال والوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتی رہی، سسرال والے قرآن خوانی کم اور کانا پھوسی اور کھسر پھسر زیادہ کرتے رہے۔ سب کے لیے یہ حیرت انگیز بات تھی کہ کمال کے پاس آخر اتنا پیسا کہاں سے آ گیا کہ اُس نے امراء کی اس بستی میں ایسا شاندار محل نما گھر بنا لیا تھا جس کی کار پورچ میں چار گاڑیوں کے کھڑا ہونے کی گنجائش، جس کے خوبصورت بیرونی لان میں طرح طرح کے پھول دار پودوں کی قطاریں جس کے وسیع لاؤنج میں اعلیٰ ترین فرنیچر، جس کے دو منزلہ بنگلے میں آٹھ جہازی سائز کے کمرے، ہر بیڈ روم میں پلازما ٹی۔ وی، ایک کل وقتی ایک جز وقتی ملازمہ، خانساماں، ڈرائیور، چوکیدار، اف۔۔۔ اف۔۔۔ اف۔۔۔

کوئی بی بی، تانیا کے کمرے کے پردوں کو چھوتی تو تانیا کہتی، ''مجھے تو اس کا براؤن رنگ پسند آ رہا تھا، کمال نے کہا نیوی بلیو اچھا ہے، تو ان کے بیڈ روم میں یہی پردے ڈلوا دیے، اس قدر مہنگائی ہے کوئی حد نہیں، صرف اس کمرے کے پردے ایک لاکھ میں پڑے ہیں۔۔۔''

کوئی اس کی شیشم کی چمچماتی برتنوں کی الماری میں سجے فرانس اور اٹلی کے برانڈڈ برتنوں کو دیکھتا، کوئی اس کے ڈرائینگ روم میں سجے آرائشی ظروف کا معائنہ کرتا، کوئی کچن کے عقبی لان میں لگی سبزیوں کا جائزہ لیتا، کوئی قالین میں دھنستے پیروں کی جنبش سے قالین کی قیمت کا اندازہ کرتا، ایک قرآن ختم کرنا بھی مسئلہ بن گیا، لہٰذا چند سیپاروں کی تلاوت کے بعد یہ سلسلہ ترک کر کے سب باقاعدہ انٹرویو اور سوالات و جوابات میں مصروف ہو گئے۔ ہر سوال پر کمال مسکراتا اور تانیا بڑی وضاحت سے جواب دیتی، کمال کو اپنے ''ترجمان'' کی کارکردگی پر پورا اعتبار بھی تو تھا۔

---

موسم کھل چکا تھا۔ سڑکوں پر صبح کا رش تھا۔ اُس کے موبائل پر اُس کے وکیل کا نمبر

چمکنے لگا، اُس نے فون اٹھالیا۔
"ہاں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں" کمال نے اُسے جواب دیا۔ اس کے وکیل کی آواز میں پریشانی تھی، جو اُس نے محسوس کر لی تھی۔ باہر کا طوفان تھم چکا تھا، نہ سورج نکلا تھا نہ سردی کم ہوئی تھی، لیکن پاگل ہوائیں تھم چکی تھیں اور بارش رک چکی تھی! البتہ اس کے اندر طوفانی جھکڑ چلنے شروع ہو گئے تھے۔

گاڑی عدالت کی عمارت میں داخل ہوئی، ڈرائیور نے ایک جگہ پھرتی سے گاڑی پارک کر دی تھی، وہ گاڑی سے اُتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، عدالت کی عمارت میں داخل ہو گیا، جہاں سیڑھیوں پر ہی اس کا وکیل اس کے انتظار میں تھا۔

کچھ دیر وہ دھیمی آواز میں کمال سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جلد ہی انہیں کمرۂ عدالت میں طلب کر لیا گیا۔

---

کمال کو گئے گھنٹہ ہو گیا تھا۔ تانیا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی، سامنے لگے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے خدا جانے کہاں تھی۔ پلازما ٹی وی اسکرین کے داہنی جانب بہت بڑی پورٹریٹ لگی تھی، کمال کی اور تانیا کی ربع صدی پہلے کی ایک خوبصورت تصویر، بائیں جانب بچوں کی تصاویر، اب تو یہ بچے اپنے بچوں کی مصروفیات میں لگے ہوئے تھے۔ بظاہر تانیا کی نظریں ٹی۔ وی پر چلتے کسی انڈین ڈرامے پر لگی ہوئی تھیں، مگر حقیقتاً وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا معاملہ اگلی پیشی تک ٹل جائے گا، یا آج فیصلہ ہو جائے گا۔

کمال پر کرپشن کے الزامات کے تحت گذشتہ کئی برسوں سے مقدمات چل رہے تھے۔ اُس کے اونچے تعلقات اب تک اسے بچاتے آئے تھے، اب بھی بچا سکتے تھے، یہ مقدمات کب ختم ہوں گے؟ یہ تو ایسا ہی تھا کہ لذیذ پلاؤ میں سے کنکر نکل آئیں اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے۔

فون کی گھنٹی بجی، موبائل پر قاسم بھٹی کا نمبر چمک رہا تھا۔ قاسم بھٹی، کمال کا وکیل تھا۔ "اللہ خیر کرے" اُس نے دعا مانگتے ہوئے فون اٹھالیا۔

''مسز کمال آپ فوراً ہاسپٹل پہنچیں، کمال صاحب کی حالت ٹھیک نہیں۔''

اور جب وہ ہاسپٹل پہنچی تو قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لاش پولیس کی زیرِ حفاظت تھی، کاغذی کارروائیاں چل رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے موت کی تصدیق کر دی تھی۔ موت زہر خوانی کی وجہ سے ہوئی۔

''کمال صاحب کو عدالت نے دس سال قید با مشقت، سات کروڑ روپئے جرمانے کی سزا سنائی تھی، لیکن اس سے قبل کہ انہیں گرفتار کیا جاتا، اُنھوں نے زہر کا کیپسول منہ میں رکھ لیا۔'' قاسم بھٹی نے اُسے بتایا تھا۔

پتا نہیں کتنے گھنٹے وہ وہیں بیٹھی رہی۔

ارسلان، قاسم بھٹی کے ساتھ بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ رشتہ داروں میں سے سوائے تانیا کہ بھائی بھابھی کے کوئی نہیں آیا تھا۔ جب وہ ایمبولینس میں کمال کی لاش لیے گھر جانے کے لیے اُٹھی تو قاسم بھٹی اُس کے پاس آیا،

''میڈم...... کمال صاحب کی جیب سے یہ پُرزہ نکلا تھا۔''

اُس نے وہ پُرزہ کھولا، لکھا تھا ''میری نمازِ جنازہ مسجدِ حسان میں پڑھائی جائے۔''

یہ مسجد حسان اُس نے اپنے گھر کی تعمیر کے دوران قبضے کی زمین پر بنوائی تھی۔

✡ ✡ ✡

۲۵/دسمبر ۲۰۱۴ء

مطبوعہ ماہنامہ الحمراء، لاہور

# ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے قلم سے

## ادبی تخلیقات:

۱۔ دستِ قاتل (افسانے) (۱۹۹۵ء)

۲۔ بارِ ہستی (افسانے) (۲۰۰۰ء)

۳۔ سوادِ شام سے پہلے (شاعری) (۲۰۰۱ء)

۴۔ دشتِ امکاں (سفرنامۂ نجد و حجاز) (۲۰۰۳ء، طبعِ ثانی ۲۰۰۹ء)

۵۔ اذنِ سفر دیا تھا کیوں؟ (سفرنامۂ ایران) (زیرِ طبع)

۶۔ نقوشِ یادِ رفتگان (زیرِ طبع)

## علمی تحقیقات:

۱۔ غلامی: ایک تحقیقی جائزہ (۱۹۸۷ء)

۲۔ مطالعۂ تہذیب (۱۹۹۳ء، طبعِ ثانی ۲۰۰۹ء، سیرت ایوارڈ یافتہ)

۳۔ جدید ترکی (۲۰۰۱ء)

۴۔ قرنِ اوّل کا ایک مدبر: مختار ثقفی (۲۰۰۴ء، طبعِ ثانی ۲۰۱۴ء)

۵۔ عرب اور موالی (۲۰۰۶ء، سیرت ایوارڈ یافتہ)

۶۔ شعوبیت: آغاز و ارتقاء (۲۰۰۷ء)

۷۔ سیرت نگاری: آغاز و ارتقاء (۲۰۱۰ء، سیرت ایوارڈ یافتہ)

۸۔ مسلمانوں میں انتہا پسندی کا آغاز: خوارج، ایک مطالعہ (۲۰۱۲ء، طبعِ ثانی ۲۰۱۵ء)